تاج آفرینش

مصر کی ایک مشہور اہلِ قلم خاتون

ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ

کے

مانند نسوانی اصلاحی مقالات اردو لباس میں

از قلم

عبد الحمید نعمانی

فہرست مضامین

انتساب

اس حقیر اصلاحی خدمت کو میں ملک کی علم دوست روشن دماغ خاتون محترمہ بیگم صاحبہ نواب سر محمد اکبر حیدری صاحبہ وزیر مالیات ممالک محروسہ سرکار عالی (حیدرآباد۔ دکن) کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں۔ جن کی زندگی ہندوستانی خواتین کی اصلاح و ترقی کی سرگرمیوں میں گذر رہی ہے۔

عبدالحمید نعمانی

میری غرض

اللہ کی کائنات میں کیسی بڑی بڑی ہیبت اور زبردست مخلوقات ہیں، جن کو دیکھکر انسان کے دل و دماغ پر خوف اور ہیبت کے جذبات طاری ہو جاتے ہیں۔ کیسے کیسے خوفناک درندے اور قوی ہیکل حیوانات ہیں جن کے سامنے ہوتے ہی انسان مرعوب ہو کر کانپ اٹھتا ہے اور بسا اوقات مارے ڈر کے غش کھا کر اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں جا پہونچتا ہے۔ آسمان آفتاب، بادل اور بجلی ان میں کونسی چیز ہے، جس کو ہم حقیر کہہ سکتے ہیں؟ اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے، بحر ذخار کی متلاطم موجیں، ہوا اور بارش کا طوفانی جھونکا اور جھڑی، ہاتھی جیسا عظیم الجثہ جانور، شیر جیسا قوی درندہ ان میں سے ہماری نظروں میں کون معمولی اور چھوٹا ہے؟ ان تمام چیزوں کی ہیبت اور قوت اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔ لیکن انسان اللہ کی وہ مکرم مخلوق ہے جو معمولی تن و توش اور مختصر سی جان لیکر سب کے بالمقابل اور سب پر بالا ہے۔ یہ آسمان اور اس کا پورا نظام شمسی اسی معمولی مخلوق کے لئے مصروف کار ہے، یہ زمین اپنی تمام وسعتوں، کھیتوں، نہروں، جھاڑوں اور پہاڑوں سمیت اسی مختصر سی جان والے کے لئے حاضر خدمت ہے۔

اُس حکیم مطلق نے ضعیف انسان کو کل کائنات کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک نورانی بصیرت عطا کی ہے۔ جس کو عوام کی دنیا میں عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی خداوندی عطیہ کی برکت سے وہ زمین آسمان اور ہوا کی تمام خوفناک مخلوقات کے خطرات سے بے خوف ہو کر اپنے گھروں میں امن و چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی ربانی عنایت کا طفیل ہے کہ انسان دوسروں سے مرعوب ہونے اور خوف کھانے کے عوض دوسروں کے لئے دہشت اور ہیبت کا سبب بنا ہوا ہے۔ آسمان و آفتاب اس کے پہلے ہی سے خادم تھے۔ اب اس کی عقل نے بجلی کو بھی گھروں کا خادم بنا دیا ہے۔ چنانچہ آج بجلی انسان کے گھروں کا چراغ جلاتی ہے

کھانے پکاتی ہے، پنکھے اور کپڑا سینے کی مشین چلاتی ہے، کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ اور بڑے بڑے کارخانوں میں جا کر دیکھو تو حیرت ہو گی۔ کہ یہ دنیا بھر کو جلا کر بھسم کر دینے والی ہولناک چیز کس طرح انسان کی انگلی کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ کمزور انسان کی عقلی قوت نے ہوا اور پانی کا سر غرور بھی نیچا کر دیا۔ آج وہ ہوا کی فضائی مملکت پر ہوائی جہازوں کے تخت پر بیٹھ کر فاتحانہ انداز میں حکمرانی کر رہا ہے۔ دریا پر بھی اس کا تسلط ہے، وہ پانی کی سطح پر دریا کی گہرائیوں میں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ موجود ہے۔ اور انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے۔ مہلک درندوں اور قوی ہیکل حیوانات کی ساری زور آزمائیاں بھی اب انسان کے پنجۂ عقل میں ایک ربر کا گیند بنی ہوئی ہیں۔ کہ جب چاہا اور جس طرح چاہا دبا دیا۔ اس نے ایسے ایسے آلات ایجاد کیے کہ ایک انگلی کی خفیف سی حرکت تنہا حیوانات تو کیا سارا جنگل لرزہ براندام کر دیتی ہے جس نورانی بصیرت کے یہ کرشمے ہوں اس سے اپنا دل و دماغ روشن کر لینے کے بعد اس خاکی پتلے کے سوا کون حقدار ہو سکتا تھا کہ آب، آتش اور ہوا کی دنیا پر حکومت کرے؟

بلاشبہ کائنات میں انسان ہی اشرف اور سب سے زیادہ عالی مرتبہ مخلوق ہے۔ اس کو دنیا میں ایک حاکم اور آقا کی حیثیت حاصل ہے۔ جب ہم اس اعلیٰ مخلوق کے حالات پر ایک گہری نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی ایک قسم اپنی جسمانی ساخت اپنے جذبات اور اپنے حوصلوں کے اعتبار سے دن رات اس تحقیق و تلاش میں مصروف ہے کہ انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے کارخانۂ عالم سے کیا کیا چیزیں تیار کرے۔ کہاں کہاں سے خراش و تراش اور کس کس آمیزش و ترکیب سے انسانی زندگی کے لئے مفید اسباب مہیا کرے۔ انسانوں کی یہ قسم مرد کہلاتی ہے۔ اور اس کو کائنات کا سر کہنا چاہیئے۔ جو اپنے تدبر اور غور و فکر کی قوت سے ہر وقت انسانیت کو بلند و بالا رکھنے کے ذرائع سوچتا رہتا ہے۔ اور اپنا سارا دماغی زور اس پر صرف کرتا ہے۔ کہ نظام کائنات کی مشین سے ایسے کل پرزے تیار ہوں جن کی ترکیب سے انسانیت مستحکم اور انسانوں کو عروج و ترقی حاصل ہو۔ لیکن کائنات کا یہ سر، برہنہ اور بے عزت رہتا اگر قدرت اس کے لئے ایک چمکتا ہوا تاج پیدا نہ کرتی۔ یہی تاج انسانوں کی دوسری قسم ہے۔ جس کو عورت کہا جاتا ہے، بلاشبہ مردوں کی قوی مخلوق اگر کائنات کا سر ہے تو عورت کی نرم و نازک ہستی

تاج آفرینش ہے۔ اور سرچشمۂ سکون و عزت، اس تاج کے بغیر یقیناً دنیا اپنی تمام رنگینیوں اور دلچسپیوں کے باوجود روکھی اور بے رونق معلوم ہوتی۔ اور مرد اپنے قلب میں ایک قسم کی وحشت اور بے چینی محسوس کرتا۔ خدا سے بڑھکر مردوں کی اس نفسی کیفیت کا علم کس کو ہو سکتا تھا۔ جو تمام چیزوں کا حقیقی خالق اور اصلی مالک ہے، جس کے دست قدرت نے دنیا کا سب سے پہلا مرد بنایا۔ پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اس نے اپنے کلام پاک میں مردوں کی اسی بے چینی کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے عورتوں کا مقصد تخلیق بتایا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

ھو الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا	وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی نے بنایا اس کا جوڑا۔ تاکہ وہ اس سے آرام اور سکون حاصل کرے۔ (سورۂ اعراف رکوع ۲۴)
ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا	اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمھارے واسطے تمھاری قسم سے جوڑے بنادئے۔ تاکہ ان سے چین حاصل کرو۔ (سورۂ روم رکوع ۲)

ان آیات کا مفہوم واضح طور پر بتاتا ہے کہ عورت کا وجود مرد کے لئے سرچشمۂ سکون و راحت ہے۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم نے اپنے معجزانہ اسلوب اور بلیغ انداز میں عورت کی حقیقت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ اس کے بعد کسی پیچیدگی کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، اس نے عورت کے لئے کہیں سکون۔ کہیں لباس اور کہیں حرث کے الفاظ استعمال کئے۔ مختلف تشبیہات اپنے مجاز میں حقیقت کا رنگ دکھا رہی ہیں۔ یہ بلیغ تعبیریں مردوں کے دلوں میں اُتار رہی ہیں کہ عورت کیا ہے؟ کیوں پیدا کی گئی اور مردوں سے اس کا تعلق کیسا ہونا چاہیئے؟ یہاں پہونچکر میں عورت کی دلخراش تاریخ دھرانا نہیں چاہتا میں صرف یہ کہہ کر آگے بڑھوں گا۔ کہ جن دماغوں نے عورت کو "پاپ کا جنم" سمجھا، جن نگاہوں نے عورت کو شوہر کی "ملکیت محض" دیکھا، جن زبانوں نے اس کو "خوبصورت شیطان" اور "بلائے عام" کے ناموں سے یاد کیا، جن سروں اور سینوں میں اس سے اس درجہ بیزاری اور ناگواری سمائی کہ پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کروادیا وہ اصل حقیقت سے اندھے تھے،

انھوں نے غلط سمجھا، غلط دیکھا۔ غلط کہا اور جو کچھ کیا غلط کیا۔ صحیح وہ ہے جس کی تعلیم اللہ کے رسول نے دی۔ صلی اللہ علیہ وسلم، اور وہ یہ کہ عورت مرد کی عزت اور سکون ہے۔ وہ شوہر کے گھر کی محافظ اور اس کے مال و اولاد کی ذمہ دار ہے۔ عورت کی شان میں یہ الفاظ اور اس کی ذات پر اس قدر اعتماد حقیقت میں اسلام کی طرف سے دنیا کو یہ سعادت بھرا پیام ہے۔ کہ عورت مرد کی زندگی میں مظلومانہ نہیں مساویانہ شریک ہے، وہ ملازم نہیں رفیق ہے۔ اسلام کا یہ پیام عورت کی حقیقی حیثیت ہی کا اعلان نہیں کرتا۔ بلکہ بہت سے نسوانی مسائل کے اختلافات کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتا ہے۔

اس پیام کو سن لینے اور سمجھ لینے کے بعد کس مرد کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ عورت کو زر و زیور کی طرح گھر کے صندوقوں میں بند کر رکھے۔ اس کی تعلیم پر معترض ہو۔ اس کے حقوق کی پامالی کرے۔ اور ان سب زیادتیوں پر مزید اپنی افضلیت کا راگ بھی ہر جگہ الاپتا پھرے پردہ یقیناً اسلام کی تعلیم ہے۔ لیکن اس کی یہ حد جو عورت کو مخفی خزانہ بنا دیتی ہے اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں۔ اسلام پردے سے عورت کی حشمت اور وقار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ سنجیدگی اور وقار کی حالت میں رہ کر ایک عورت اپنے شوہر کے لئے اطمینان وعزت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور چوری کی چیز بن جانے کے بعد تو وہ اپنی صحت اور دماغ دونوں کو زنگ آلود کرلے گی۔ اور شوہر کے لئے بجائے سکونِ قلب ہونے کے اکثر عذاب جان ہی ثابت ہوگی۔

عورت کی تعلیم پر اعتراض بھی اسلام کے پیام سے بے خبری کا عجیب وغریب مظاہرہ ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ تعلیم نسواں کے مخالف عورت کے جاہل رکھنے کی تائید مذہب سے چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو یہ جرأت ازواج مطہرات، صحابیات اور قرون اولیٰ کی اہل علم خواتین اور ان کے علمی کمالات اور قابلیتوں کے باوجود کیوں کر ہوتی ہے۔ اگر اپنے اسلاف اور اپنی تاریخ سے انھوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں تو عقل کی دشمنی پر کیوں آمادہ ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر مرد کو تعلیم کی ضرورت ہے، تو عورت بھی اس کی ضرورتمند ہے۔ اس لئے کہ جاہل رہ کر وہ صرف حیوانیت کے درجات

طے کر سکتی ہے۔ شوہر کے سکون و عزت کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

اسی طرح اگر مرد کے کچھ حقوق ہیں اور وہ ان کی حفاظت کا حق رکھتا ہے تو عورت کے لئے بھی کچھ حقوق ہونے چاہئیں اور اس کو بھی اپنے حقوق کی حمایت کا اختیار دینا چاہیئے کیونکہ بے بس اور مقہور لونڈی رہ کر وہ شوہر کا سرمایۂ راحت و احترام نہیں بن سکتی۔ اسلام نے تو کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ لیکن کس قدر تعجب اور ساتھ ہی افسوس کی بات ہے کہ آج اپنے حقوق کے لئے کسی خاتون کی لب کشائی اس کی شوخی اور بے شرمی سمجھی جاتی ہے۔ کیا عورت اپنے شوہر کے گھر، اس کے مال اور اولاد کی ذمّہ دار نہیں ہے۔ اگر ہے تو کیا بلا حقوق دیئے کسی پر کوئی ذمّہ داری عائد کی جا سکتی ہے۔ اور جب عورت کے حقوق ہیں تو کیا اس کو اپنے حقوق کی حمایت و مدافعت سے روکنا غیر تمندی اور اسلام کی کوئی خدمت ہو گی۔ اور پھر کیا حیا اور شرم کا معیار آج قرون اولیٰ عہد صحابہؓ بلکہ عہد نبوی سے بھی اونچا ہو گیا۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنیوالے جانتے ہیں کہ نبوت کے عہد سعادت میں عورتوں کو اپنے حقوق کی حمایت کی پوری طرح آزادی حاصل تھی۔ کتب احادیث کے اوراق آج بھی شاہد ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ نامی ایک لونڈی خرید کر اس کو آزاد کر دیا۔ آزادی نصیب ہونے کے بعد اُن کو حق تھا کہ وہ اپنے عہد غلامی کے شوہر مغیث سے جن سے وہ راضی نہ تھیں علیٰحدہ ہو جائیں، چنانچہ انقطاع تعلق کا اعلان کر دیا۔ لیکن مغیث کی حالت دگرگوں تھی، وہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے اور چیخیں مار مار کر روتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھکر فرمایا بریرہ! خدا سے ڈرو مغیث تمھارا شوہر ہے، اور تمھارے بچے کا باپ، بریرہ نے کہا کیا آپ مجھے رجعت کا حکم فرماتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ میں تو صرف سفارش کرتا ہوں بریرہ نے کہا تو پھر مجھے ان کی ضرورت نہیں، اس سے بڑھکر عورت کی استقلالی حیثیت اور حقوقی قوت کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔ کیا اس کے بعد بھی ہم اسلام کے نام پر عورتوں کے حقوق پامال کر سکتے ہیں؟

اب رہ گئی مردوں کی افضلیت تو وہ بھی ایک ذہنی خوش اعتقادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ جب عورت حقوق و اختیارات رکھتی ہے اور خدا کی طرف سے اپنے حقوق و اختیارات کی حفاظت اور مدافعت کی اس کو اجازت بھی دی گئی ہے تو وہ اتنی ہی اکمل اور افضل انسان ہے جتنا مرد، یہی وجہ ہے کہ کسی عمل صالح کی جزا کیلئے خدا کے پاس عورت مرد کا کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک نیکی کا جتنا اور جس طرح مرد کو عوض دینے کا اعلان کرتا ہے۔ اتنا ہی اور اسی طرح عورت کو دینے کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ اور پھر انسانیت جو اس دنیا کا اصل سرمایہ ہے اس میں عورت مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانیت دونوں کے اشتراک سے ہے۔ یعنے نہ تنہا مرد انسان ہے اور نہ تنہا عورت۔ بلکہ دونوں ملکر ایک انسان ہیں۔ یورپ والوں نے آج اپنی ساری علمی تحقیقات کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے لیکن عرب کے اُمی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ اُمّی وابی نے آج سے سینکڑوں برس قبل ایک مختصر سے جملے میں اس حقیقت کو روشن کر دیا تھا۔ ارشاد گرامی ہے
من تزوّج فقد استکمل نصف الایمان جس نے شادی کرلی اس نے نصف ایمان کی تکمیل کرلی شریعت کی زبان اور اہل حق کی اصطلاح میں ایمان ہی انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اس بنا پر عورت مرد کی انسانیت کو مکمل کرنے والی ہستی ہے۔ اور مرد عورت کی تکمیل انسانیت کا سبب جب حقیقت یہ ہے تو مردوں کی افضلیت کا دعویٰ ایک بے سُرا راگ ہے اور کچھ نہیں۔ اور افضلیّت بھی وہ جس کا مفہوم مردوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مرد ایک با اختیار فرد ہے۔ اور عورت ایک بے بس اور مسلوب الاختیار لونڈی۔

قرآن کریم کی آیت الرّجال قوّامون علی النّساءِ یعنے مرد عورتوں کے محافظ ہیں۔ اور اسی طرح وہ تمام آیات و احادیث جن سے بظاہر مردوں کی عورتوں پر فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت میں طرفین کے موازنہ اور مرد کے بیان افضلیت کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان سے یا تو دونوں کے اعمال و فرائض کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے یا اور کسی دوسری خصوصیت کا اظہار۔ پھر جب مرد عورت اپنے اپنے اعمال اور فرائض کے اعتبار سے الگ ہیں تو درمیان میں افضلیت کا سوال ہی غلط ہے۔ پہاڑ توڑنے والے اور پھول توڑنے والے میں

مقابلہ کس معنی میں صحیح ہے؟ ایک دولت پیدا کرنیوالا ہے اور دوسرا اس کی نگہداشت اور اس کو مفید کاموں میں صرف کرنے والا ہم کس طرح ایک کو افضل اور دوسرے کو کمتر کہہ سکتے ہیں جبکہ دونوں کے کام اپنی اپنی جگہ پر اہم اور ضروری ہیں۔

غرض عورت کی تعلیم اور اس کے مقررہ حقوق کی پامالی سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور شدید پردے کی پابندی کرانا تو ستم بالائے ستم ہے۔ جس کی اجازت وہ مذہب ہرگز نہیں دے سکتا جو دنیا کیلئے جس میں عورتیں بھی شامل ہیں رحمت بن کر آیا ہے واقعہ یہ ہے کہ مردوں نے یا تو اب تک عورت کی وہ حقیقت نہیں سمجھی جو خالق کائنات نے قرآن پاک میں سمجھائی ہے۔ یا پھر دیدہ و دانستہ وہ اس سے تغافل برت رہے ہیں لیکن واضح رہے کہ جہل کی ایک مدت اور تغافل کی ایک حد ہونی چاہیئے۔ ورنہ کسی فوری انقلاب کے ہاتھوں خطرناک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ملک وملت کو نہایت تلخ اور ناگوار نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اپنے ان خیالات کے ساتھ قوم کے سامنے میں یہ چند نسوانی اصلاحی مقالات پیش کرتا ہوں۔ یہ مقالات جیسا کہ آگے چلکر آپ کو معلوم ہوگا مصر کی ایک مسلمان اہل قلم خاتون کے اصلاحی جذبات وخیالات ہیں جس کا دل اپنی جنس کی اصلاح وترقی کے لئے غیر معمولی درد رکھتا تھا۔ ان مقالات کا مطالعہ یقیناً تھوڑی دیر کے لئے ہندوستان کے مسلمان مردوں اور عورتوں کو مجبور کریگا کہ وہ اپنی موجودہ حالت اور حیثیت پر غور کی ایک نظر ڈالیں، اور ان مقالات کی اشاعت سے یہی میری غرض ہے

عبدالحمید نعمانی

۲۰ نومبر ۱۹۳۲ء

مصر میں نسوانی تحریکات کی پہلی علمبردار خاتون

ملک خانم عرف باحثۃالبادیہ

باحثۃ البادیہ

مصر کی نسوانی تحریکات کے سلسلہ میں آج تو متعدد خواتین کے نام لئے جاتے ہیں۔ جو اپنی جنس کی اصلاح اور تہذیب کیلئے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن آج سے پندرہ بیس برس قبل جبکہ مصر میں نسوانی بیداری کی ابتدا ہو رہی تھی باحثۃ البادیہ ہی وہ اہل قلم خاتون تھی جس کا دل عورتوں کی اصلاح و ترقی کے لئے مضطرب تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قلبی بے تابی کا اظہار اپنی زبان اور قلم دونوں سے کیا۔ اس نے عام مجالس میں اس موضوع پر تقریریں کیں۔ اور اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ اور اپنی بہنوں کو غفلت کے گوشوں سے باہر نکلنے کی دعوت عام دی۔

باحثۃ البادیہ ایک وطن پرور مصری خاتون تھی۔ وہ مسلمان تھی، اہل قلم تھی، نقادہ تھی اور مصلحہ تھی۔ اس کے مضامین سے اس کی ان تمام خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ ناظرین آئندہ صفحات میں خود ملاحظہ فرمائیں گے۔

حالات زندگی

__ولادت__ باحثۃ البادیہ کی پیدائش ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء میں دوشنبہ کے دن قاہرہ میں ہوئی اس کا باپ مصر کا ایک ممتاز لغوی محقق حفنی بک ناصف ہے۔ جو مصری حکومت کے کابینہ وزارت میں کبھی وزیر عدالت اور کبھی وزیر تعلیمات رہ چکا ہے۔ حفنی بک ناصف عربی علوم و آداب میں کمال کے ساتھ ساتھ اپنے قلب میں نوجوانوں کی تہذیب و ترقی کا درد رکھتا تھا۔ وہ دل سے متمنی تھا کہ قوم کا نوجوان طبقہ بیدار ہو۔ اور ان کے قوائے عمل میں بیداری کی روح پیدا ہو جائے۔ باپ کے انہیں خیالات کا نتیجہ تھا۔ کہ بیٹی باحثۃ البادیہ جیسی مصلحہ اور صاحب قلم خاتون ثابت ہوئی۔

__تعلیم__۔ باحثۃ البادیہ کی ابتدائی تعلیم فرانسیسی مدارس میں ہوئی۔ جہاں سے فراغت کے بعد

وہ ہائی اسکول میں داخل ہوئی۔ اس زمانہ میں عام طور سے لوگ اپنی لڑکیوں کو ہائی اسکولوں میں داخل نہیں کرتے تھے۔ باحثۃ البادیہ پہلی لڑکی تھی جو اپنے خرچ سے ہائی اسکول میں داخل ہوئی۔ چوتھے سال جب سررشتہ تعلیمات نے اعلان کیا۔ کہ مدرسہ کے لڑکوں کے امتحان میں لڑکیوں کو بھی شرکت کی اجازت دیجا سکتی ہے۔ تو باحثۃ البادیہ نے شرکت کی درخواست دی جو منظور ہوئی۔ اور وہ امتحان میں کامیاب بھی ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ اپنی کامیابی پر اس نے ایک قصیدہ اخبار "المؤید" میں لکھا جس میں مصر کی طرف سے اس فخر کا اظہار کیا گیا تھا۔ کہ اب اس کی لڑکیاں لڑکوں کے برابر ہو گئیں۔

باحثۃ البادیہ مدرسہ میں کند ذہن اور سست لڑکیوں کی طرح سیدھی نہ تھی۔ بلکہ وہ بڑی شریر تھی۔ ایک مرتبہ اس کے والد نے مدرسہ میں آکر تمام مدرسین سے اس کے حالات دریافت کئے تو سبھوں نے اس کی شرارت کی شکایت کی۔ صرف ایک مدرس مصطفےٰ بک صبری نے۔ جو جغرافیہ پڑھاتا تھا۔ اس کی شکایت نہیں کی۔ حفنی بک نے اس سے کہا۔ غالباً آپ کے درجے میں میری لڑکی بہت سنجیدہ اور خاموش رہتی ہے۔ اس لئے کہ آپ کے سوا ہر مدرس اس کا شاکی ہے۔ مدرس نے جواب دیا کہ شکایت تو مجھکو بھی ہے۔ مگر میں نے اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔

اسکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں محکمہ تعلیمات کے حسب الحکم وہ اسی مدرسہ میں لڑکیوں کو تعلیم دیتی رہی۔ وہ بچپن سے فرانسیسی زبان جانتی تھی۔ اور بلا تکلف بولتی تھی خوش قسمتی سے اس کے اساتذہ میں ایک خاتون مس وائلڈ بھی تھی۔ جو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتی تھی۔ باحثۃ البادیہ نے بہت کم عرصہ میں اس سے انگریزی بھی سیکھ لی پھر تو وہ فرانسیسی کی طرح بلاتکلف انگریزی بھی بولنے لگی۔

ایک قابل ذکر خصوصیت باحثۃ البادیہ کی یہ بھی ہے کہ وہ شہر کی معزز خواتین کے گھروں پر جاتی اور ان سے ملکر لڑکیوں کو مدارس میں داخل کرنے کی درخواست کرتی تھی

ساتھ ہی ان کو ہر طرح مطمئن کرتی اور خاص عنایت و اہتمام کا وعدہ کرتی ۔ چنانچہ موصوفہ کی اس کوشش سے مدرسہ میں معزز گھرانوں کی بہت سی لڑکیاں داخل ہوگئیں ۔ ورنہ اس سے قبل مدرسہ صرف غربا کے گھروں کی لڑکیوں سے بھرا رہتا تھا۔

شادی حفنی بک ناصف کے اکثر دوستوں اور ملنے والوں کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ باحثۃ البادیۃ نے زمانہ تعلیم ہی میں متعدد معزز اور دولتمند گھرانوں سے آئے ہوئے پیغاموں کو رد کر دیا تھا۔ وہ کسی طرح تکمیل تعلیم پر شادی کو مقدم سمجھنے کیلئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ تعلیم ختم کر لینے کے بعد حفنی بک کے ایک معتمد دوست شیخ عبدالکریم سلمان کی وساطت سے جو محکمہ شرعیہ عالیہ کے صدر تھے باحثۃ البادیہ کا عقد مقام فیوم کے ایک فاضل شیخ العرب عبدالستار باسل سے ہوگیا۔ عقد کے تھوڑے ہی دنوں بعد باحثۃ البادیہ اپنے شوہر کے گھر آگئی۔ جو فیوم کے پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا۔

مضمون نگاری دامن کوہ میں بیٹھکر جب اس تعلیمیافتہ خاتون نے اپنے جذبات اصلاح و بیداری کو الفاظ و عبارت میں ادا کرنے کیلئے اخبارات و رسائل میں مقالات لکھنے شروع کئے تو تحریر کے نیچے اپنے اصلی نام " ملک خانم " کے عوض باحثۃ البادیہ لکھا۔ یعنی صحرا کی بحث کرنیوالی۔ ملک خانم کا یہ مستعار نام اس وقت پوشیدہ نہ رہ سکا۔ جب اس کو قاہرہ کی خواتین کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کا موقع ہوا۔ اس کے بعد سے مصری پبلک کو باحثۃ البادیہ کی حقیقت کا علم ہوگیا۔

سب سے پہلے باحثۃ البادیہ نے جو مقالہ سپرد قلم کیا اس میں یہ تجویز قوم کے سامنے پیش کی۔ کہ مصر میں بھی " مقابر عظما " کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ جس طرح لندن میں ویسٹ منسٹر اور پیرس میں پنتھیون ہے۔

سیاسیات باحثۃ البادیہ نے نسائیات کے ہر پہلو پر اپنے خیالات کا نہایت وضاحت سے اظہار کیا۔ اور مضامین لکھے۔ البتہ سیاسیات میں اس نے بہت کم حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ

کہا جا سکتا ہے وہ اس کا ایک قصیدہ ہے۔ جس میں اس نے قوم کو اغیار کی استعماری سیاست پر تنبیہ کیا ہے۔ اور آزادی کی قدر و قیمت بتائی ہے۔ اس نے اپنے اس قصیدے میں وطنیت اور آزادی کے وہ جذبات پیش کئے ہیں۔ کہ موجودہ مصری حکومت اس کی اشاعت کی اجازت بھی نہیں دے سکتی۔

جنگ طرابلس کے موقع پر باحثۃ البادیہ نے فیوم کی عورتوں کو جمع کیا۔ اور ترکی کی امداد کے لئے ایک موثر تقریر کی۔ سینکڑوں گنی کا چندہ کیا۔ اور ترکوں کو بھیج دیا۔ ابھی جنگ عظیم کے زمانہ میں اس نے سو قمیصیں اور سو چادریں اپنے ہاتھ سے تیار کیں۔ اور انجمن ہلال احمر کے حوالے کیا۔ اگرچہ باحثۃ البادیہ نے سیاسیات پر خامہ فرسائی نہیں کی۔ اور ملکی حوادث پر مقالات نہیں لکھے۔ لیکن اس کے جذبات اور اس کا دماغ اس چیز سے خالی نہ تھا۔ اس کی سیاسیات سے دلچسپی کا اسی قدر ثبوت کافی ہے کہ جنگ عظیم کے ایام میں حکومت باحثۃ البادیہ کو جلا وطن کر دینے پر غور کر رہی تھی۔ لیکن بعد میں اس خوف سے کہ کہیں یہ جلا وطنی عام اضطراب کا باعث نہ بن جائے۔ صرف اس پر اکتفا کیا گیا۔ کہ وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لے۔

کارنامے اس کے کارناموں میں سب سے زیادہ اہم وہ مضامین ہیں جو اس نے نسائیات کے عنوان سے اخبارات میں لکھے۔ نسوانی مسائل کا حل جس طرح ایک اہل علم خاتون کر سکتی ہے دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ باحثۃ البادیہ نے نسائیات کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ جس موضوع پر بھی لکھا خوب لکھا۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہب اور عادات کے حدود میں رہ کر اصلاحات پیش کرتی ہے۔ مصر میں آزادی نسواں کی آواز سب سے پہلے مرحوم قاسم امین نے بلند کی تھی۔ لیکن چونکہ ان کے مضامین مذہب اور عادات کی رعایت سے خالی ہوتے تھے۔ اس لئے ان کا اثر عوام پر برا پڑتا تھا۔ ناظرین آگے چل کر دیکھیں گے کہ باحثۃ البادیہ کس طرح نسوانی مسائل میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے

جانے نہیں دیتی اور کس طرح وہ انتہا پسندی اور رجعت قہقری کے بین بین اپنا راستہ نکالتی ہے۔

باختۃ البادیہ نے ایشیائے کوچک اور استنبول کا سفر بھی کیا۔ اس سیاحت کے دوران میں اس کے لئے افادے اور استفادے کے بہت سے مواقع پیش آئے۔ موصوفہ کے کارناموں میں ایک نسوانی انجمن بھی ہے جس کا نام جمعیۃ النساء التہذیبی ہے۔ اس انجمن میں مصری خواتین کے علاوہ فرنچ اور انگریز خواتین بھی شریک ہیں۔

مفلوک الحال اور فقیر خواتین کے لئے باختۃ البادیہ نے ایک خاص دستور العمل بنایا تھا۔ جس میں ان کیلئے مناسب مشاغل تجویز کئے گئے تھے۔ اسی طرح اس نے مفلس خواتین کے قیام و سکونت کیلئے ایک مکان کی تعمیر کی تجویز بھی کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی میراث کا کل حصہ اپنے اس دستور العمل کی تکمیل کے لئے وقف کردے۔

انتقال اکتوبر ۱۹۱۸ء کی ابتدائی تاریخوں میں باختۃ البادیہ کا بھائی قاہرہ میں کسی سیاسی حادثے میں گرفتار ہوا۔ والدین علالت پر فرش تھے۔ خود باختۃ البادیہ بھی بخار میں مبتلا تھی۔ خبر یہ تھی کہ فوجی عدالت سے اس کے بھائی کو پھانسی کی سزا ملنے والی ہے۔ اس لئے باختۃ البادیہ آخری ملاقات کیلئے باوجود ڈاکٹروں کی ممانعت کے گئی۔ واپسی پر مرض بڑھتا گیا۔ مرنے سے دو روز پیشتر اس کی یہ حالت تھی کہ پہلے دن تو مسلسل بولتی رہی۔ دوسرے دن رک رک کر اور بے ربط باتیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں تیسرے دن ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرتے وقت باختۃ البادیہ کی عمر ۳۲ برس کی تھی۔ وہ دوران شباب میں دنیا سے گئی۔ اور اپنے ساتھ تمام اصلاحی دستور العمل بھی لیتی گئی۔ مصر نے اپنی اس محسنہ کیساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کی وفات کے دو سال بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مرحومہ کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں حرم شعراوی پاشا نے اپنی طرف سے باختۃ البادیہ کی ایک بڑی تصویر پیش کی جو مصر

یونیورسٹی کے ایک کمرہ میں لگا دی گئی۔ اور اس کا نام بطور یادگار غرفۂ باحثۃ البادیہ رکھ دیا گیا۔

باحثۃ البادیہ کے سیاسی خیالات کے سلسلہ میں اس کے جس قصیدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اس کے ان سیاسی افکار کا مجموعہ ہے۔ جو اس نے قانون مطابع (پریس ایکٹ) کے اجرا پر ظاہر کئے تھے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ جو حقیقت میں اس کے سیاسی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں

وہ کہتی ہے کہ اے قوم جس کی

یا امۃ نثرت منظومها الغیر — تنظیم کو زمانے کی گردشوں نے منتشر کر دیا

حتى ما صبر و نار الشر تستعر — کب تک صبر کرتی رہےگی۔ حالانکہ شرارت کی آگ مشتعل ہے

ماذا تقولون فی ضیم یراد بکم — اس ظلم پر تم کیا کہتے ہو جو تم پر کیا جا رہا ہے

حتى كأنكم الاوتاد والحمر — گویا تم میخیں اور گدھے ہو،

ستسلبون غدا اغلى نفائسكم — اس کے بعد تو تم اپنی سب سے بیش قیمت شے

حریۃ ضاع فی تحصیلها العمر — یعنی آزادی بھی کھو دو گے جس کے حصول میں زندگیاں

حریۃ طالما منوا بها كذبا — قربان کی گئی ہیں۔ وہ آزادی جو بارہا

على بنی النیل فی الآفاق وافتخروا — فرزندان نیل کو جھوٹے طور پر عطا کی گئی ہے

اور فخریہ اس کا ڈنکا ساری دنیا میں بجایا گیا۔

باختہ البادیہ کے خیالات

پردہ کہ بے پردگی ؟

سروست میں پردہ پر مذہبی یا اقتصادی حیثیت سے بحث کرنا نہیں چاہتی بلکہ
میں چاہتی ہوں کہ اجتماعی اور معاشرتی پہلو کو سامنے رکھ کر رسم پردہ پر تبصرہ کروں۔
میں اپنے جن خیالات کا اظہار کروں گی۔ اس کی بنیاد کسی کی تقلید پر نہ ہوگی۔ بلکہ وہ میرا
مشاہدہ ہوگا اور ذاتی تجربہ۔ مختلف جماعتوں کی خواتین سے ملکر جو نتائج میں نے حاصل
کیئے ہیں ان کی روشنی میں اس رسم پر تنقید کروں گی۔ اور ضرورت بھی اسی کی ہے کہ محض
تخیل اور نری بحث پر تجربات اور مشاہدات کو مقدم رکھا جائے۔ اس لئے کہ عینی مشاہدے
سے جو معلومات حاصل ہوتے ہیں ان کا دل پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر ہوتا ہے اور مدتوں
حواس میں اس کی یاد باقی رہتی ہے۔ اس کے برعکس جن معلومات کی بنیاد بحث و مباحثہ
قیاس اور تخیل پر ہوتی ہے۔ دلوں پر ان کا نقش چند لمحوں کیلئے پیدا ہوتا ہے۔ اور لیس۔
بچے کو آپ آگ نہ چھونے کی نصیحت فرماتے رہیئے۔ اور جلنے کی تکلیف سے ڈراتے
رہیئے۔ لیکن اس کا شوق حرکت اور جذبۂ جستجو ہر وقت انگارہ تک انگلیاں پہنچا دینے
کا فریب دیتا رہے گا۔ اور بالآخر ایک مرتبہ وہ آپ کی بار بار کی نصیحت کو نظر انداز کرکے
آگ چھولیگا۔ اب جبکہ اس کی انگلیاں جل گئی ہوں گی آپ فرمائش پر فرمائش کیجیے۔ لیکن
چھونا تو الگ رہا وہ آگ دیکھتے ہی دور بھاگے گا۔
میں محض کسی کے یہ کہدینے سے کہ " پردہ عورتوں کیلئے ایک بار گراں اور جان کی

مصیبت ہے۔ اس کو اٹھا دینے کی تائید نہیں کر سکتی۔ اور نہ کسی کی اس رائے سے کہ بے پردگی قوم پر ایک بلا اور وبال ہے پردہ کی حمایت کروں گی۔ میں لوگوں کی رایوں اور خیالات کی رو میں نہیں بلکہ ذاتی تجربات کی روشنی میں راہ مستقیم کی تلاش کرونگی۔ اور منزل مقصود کا پتہ چلاؤں گی۔

ہمارے گرد و پیش مختلف طبقے اور مختلف جماعتیں ہیں۔ ہم کو ان تمام طبقوں اور جماعتوں پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کی نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور سبھوں کے حالات ملحوظ رکھ کر ایک راہ نکالنی چاہیئے۔ یہی منزل مقصود کی راہ ہوگی۔ اسی پر چلکر ہم چاہے پردہ کے حامیوں میں جا ملیں خواہ پردہ کے مخالفین میں ہمارا شمار ہونے لگے۔

مردوں کی طرح ہر قوم میں عورتوں کے بھی تین طبقے ہیں۔ اعلیٰ۔ ادنیٰ اور درمیانی یا یوں کہیئے۔ عوام۔ خواص اور متوسط۔ ان تینوں طبقوں میں درمیانی طبقہ سب سے زیادہ صحیح اخلاق اور عمدہ آداب و عادات رکھتا ہے۔ اور یہ محض تربیت اور پرداخت کا نتیجہ ہے۔ خواص کا طبقہ یعنی متموّل اور صاحب ثروت خواتین، کھیل تماشہ اور سیر و تفریح کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سیر و تفریح اور کھیل و تماشہ کے مقامات خرابیوں اور برائیوں کے گھر ہیں۔ اور خصوصاً ایسی حالت میں، کہ تماشہ دیکھنے والوں کو کافی فرصت ہو۔ اور جملہ امور خانہ داری حتیٰ کہ بچوں کی نگرانی اور تربیت بھی نوکروں اور ماماؤں کے سپرد ہو۔ یہ طبقہ تو درحقیقت بالکل عیش پسند اور راحت طلب زندگی بسر کرتا ہے اور اس لئے بیکاری اور سستی کا عادی ہو چکا ہے

اب رہا عوام کا طبقہ تو وہ اپنی معاشی ضروریات کے ہاتھوں مجبور ہے کہ بر سر بازار عمل کا ہر دروازہ کھٹکھٹائے۔ اس طبقہ کی عورتیں کارخانوں اور کھیتی باڑی کے کاموں میں مردوں کے ساتھ پوری طرح خلط ملط رکھتی ہیں۔ دنیا کی ہر قوم میں آداب کے اعتبار سے یہ طبقہ بہت ناقص ہے۔ مغربی قوموں کا دامن بھی اس داغ سے پاک نہیں

حالانکہ وہ ہماری طرح نہ پردے کی پابند ہیں۔ نہ قدیم مراسم و عادات کی۔

خواص و عوام کے برعکس درمیانی طبقہ ہمیشہ سے اچھی حالت میں ہے۔ اس طبقہ کی زندگی خواص و عوام دونوں سے زیادہ باوقار رہی ہے۔ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو رہا ہو کہ قوموں کے مختلف طبقات اور ان کے عادات و اطوار کا پردے سے کیا تعلق ؟ اور پھر طبقوں اور جماعتوں کی تقسیم بھی ایسی وسیع کہ اس میں اُن قوموں کو بھی داخل کر لیا گیا ہے۔ جن میں سرے سے پردہ کا رواج ہی نہیں۔ لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ جب ہم قوموں کے مختلف طبقات کو اچھی طرح پہچان لیں گے۔ اور ہر طبقے کے مرد و زن کے اختلاط کا صحیح صحیح اندازہ ہم کو ہو جائیگا۔ تو ہم نہایت آسانی سے یہ حکم صادر کر سکیں گے۔ کہ جس طبقہ کی عورتیں مردوں سے زیادہ اختلاط رکھتی ہیں۔ وہی طبقہ سب سے زیادہ خرابیوں کا باعث ہے۔

اگر مصر میں عورتوں کے حوادث کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو واضح ہو جائیگا۔ کہ عوام اس کا شکار زیادہ ہیں۔ میں نے دیہاتوں میں جا کر کاشتکار اور مزدور عورتوں سے گفتگو کی ہے۔ اور ان کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ بھی کیا ہے۔ ان کی میل جول اور انکی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ کہ وہ بظاہر بہت متین اور سنجیدہ ہیں۔ اور یہ اس لئے۔ کہ گاؤں میں ان کو کوئی شوخ نمونہ نظر نہیں آتا۔ جس کی اتباع کیلئے تیار ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر دیہاتوں کو شہر والوں کے سے مواقع حاصل ہوں اور وہاں بھی تفریح گاہیں بنا دی جائیں تو دیہات کی یہ بظاہر سادہ لوح اور سنجیدہ عورتیں کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ یقیناً ان کی حالت شہر کی ان عورتوں کی سی ہو جائیگی۔ جو سبزی اور ترکاری فروخت کرتی ہیں۔ جن کے اخلاق کی پستی کا اصلی سبب تو خراب تربیت ہے۔ لیکن مردوں کے اختلاط نے ان کو اور بھی نیچے گرا دیا ہے۔

یہ عوام کی حالت ہے۔ اب اگر خواص پر نظر کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ دولت مند خواتین کا سارا وقت اپنے بناؤ سنگھار اور اپنی پوشاک کی جدت طرازی میں صرف ہوتا ہے

وہ نئی نئی وضع وفیشن کے خوشنما لباسوں کی نمائش کرنا چاہتی ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ باہر نکلتی رہتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ پردہ اٹھا دیا جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش آزادی کے شریف جذبہ پر نہیں۔ اور نہ اس خیال سے ہے کہ پردہ علوم کی تحصیل اور علما سے استفادہ میں حائل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ان کو پردہ سے باہر آنے کی اجازت ملجاتی۔ لیکن خواتین کے موجودہ جہل اور مردوں کے نقائص کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی طرح مناسب نہیں کہ عورتوں اور مردوں میں اختلاط کی اجازت دی جائے۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ فرنگی قومیں جن کے مرد وزن سبھی تعلیمیافتہ ہوتے ہیں۔ اس بے حجابی اور اختلاط عام سے سخت شاکی ہیں اور آئے دن اپنی اجتماعی اور معاشرتی خرابیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ فرنگی قوموں کی موجودہ حالت اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان کی بہیمی قوتیں تربیت کی دیواروں کو منہدم کرکے آگے بڑھ جاتی ہیں۔

اب مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے اور وہ یہ کہ دفعۃً پردہ ہی نہیں جایا جاسکتا۔ ہماری خواتین پردہ میں رہنے کی عادی ہیں۔ اگر ان کو دفعۃً حکم دیا جائے کہ وہ پردہ اٹھا دیں تو اس فوری انقلاب کا اثر خود ان پر بہت برا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ملک و ملت کے حق میں بھی برا ہوگا۔ اگر کسی عمارت کو گرا دینا ہی مقصود ہے تو تدریجاً گرانا چاہیئے۔ ورنہ مکان کی لکڑیاں۔ کارآمد شیشے اور دوسرے سامان سبھی بیک وقت گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے جس سے معماروں اور راستہ چلنے والوں کے زخمی ہو جانیکا بھی خطرہ ہے۔ عورت میں عفّت وحیا کے جذبات حقیقت میں کسی پرانے مکان کے باقیات الصالحات ہیں۔ اور اس کا موجودہ پردہ مکان کا بوسیدہ اور پرانا حصّہ ہے جس کی مرمّت اور درستی کے اجزا مذہب اور وطنیت کے جذبات ہیں۔

کس طرح عورتوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ پردے سے باہر نکلیں۔ حالانکہ ہم میں سے جب کوئی خاتون راستہ پر بے نقاب چلتی ہے تو اس کے کان بیہودہ کلمات اور ذلیل

الفاظ سنتے ہیں۔ بری نگاہیں اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ مردوں کی موجودہ ذہنیت اور ان کا ماحول کسی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ خواتین کا معاملہ ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اور پھر ہماری خواتین جن کی فہم و فراست شیر خوار بچوں کی سی ہے۔ ان کو دفعتہً پردے سے باہر نکالنا اپنے اوپر خرابیوں کا دروازہ کھول لینا ہے۔ اور ذرا اس سوال پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جاہل یا ناقص تعلیم کی خاتون کسی نوجوان کے ساتھ بیٹھکر کیا باتیں کرے گی؟ کیا وہ علوم و فنون پر بحث و مباحثہ کریگی۔ حالانکہ اس کو موجودہ علوم کی اہمیت کا احساس تک نہیں اور جو کچھ اس نے سیکھا ہے وہ پوست سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ پھر کیا سیاسیات پر تبادلہ خیالات کریگی؟ اور حالت یہ ہے کہ اب تک اس کو یہی معلوم نہیں کہ انگلستان جزائر اوکینیا کس سمت پر واقع ہے۔ وہ غریب "دستور" کے مفہوم تک سے ناآشنا ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ استعمار یعنے کیا؟ وہ ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھکر جو کچھ بول سکتی ہے وہ یہ کہ اس نوجوان کی ہیئت اور حسن میں اس کو کیا پسند آیا۔ اور یہیں سے گمراہیوں اور خرابیوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

مصر میں تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد روز بروز ترقی پر ہے۔ آج بھی ان میں بعض ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی بہنوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ عنقریب وہ زمانہ آنیوالا ہے۔ جب مصر مصر میں عورتوں کی ایک جماعت پیدا ہو جائیگی۔ لیکن وہ یہ تعویذ اور گنڈے والی جماعت نہ ہوگی۔

الغرض بے حجابی میرے نزدیک کوئی بری بات نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہمارے اور مردوں کے اخلاق کمال کے درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اخلاقی کمال اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے قوم میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو پردہ کی حمایت میں انتہائی تشدد سے کام لے رہا ہے۔ اس نے عورتوں کو گھروں میں تقریبًا مقید کر رکھا ہے۔ ان پر تازہ ہوا حرام کر دی ہے مکانوں کی تنگ و تاریک فضا میں خواہ ان کی صحت کو گھن لگ چکے ہوں اور وہ چلنے

پھرنے سے بھی معذور ہو رہی ہوں۔ اور بعض سیانے تو ایسے بھی ہیں جو علی الاعلان بڑے فخر کے ساتھ اس خوبی کا اظہار کرتے ہیں کہ عمر گذر گئی مگر عورت نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ یہ لوگ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ قدرت نے عورت کو دو پاؤں چلنے اور دو آنکھیں دیکھنے کیلئے دی ہیں۔ اگر باپ۔ بھائی یا شوہر ساتھ میں ہو اور ایک چادر سے عورت نے اپنی متانت اور وقار برقرار کرلیا ہو تو اس کو باہر نکلنے اور سیر و تفریح کی غرض سے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی موجودہ شکل کو بے پردہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اب بھی وہ پردے ہی میں ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ پردہ اور اس کے متعلق اختلافات کا تصفیہ کرنیوالا منصف جج آنیوالا زمانہ ہے۔ کتنے ہی مسائل تھے جن میں قوم کا اختلاف تھا۔ اور موافق و مخالف پارٹیاں تھیں۔ لیکن زمانہ کی زبان نے آگے چلکر ایک جماعت کی تائید کردی اور مقابل کی جماعت کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔

میری ذاتی رائے ہے کہ پردہ کو بالکلیہ اٹھا دینے کا وقت ابتک نہیں آیا ہے اس لئے عورتوں کو صحیح اور سچی تعلیم دو۔ ان کی تربیت کا انتظام کرو۔ اپنے اخلاق کی اصلاح کرو۔ نوجوانوں کو مہذب بناؤ۔ تاآنکہ ہمارا قومی اجتماع مہذب ہوجائے۔ اس کے بعد عورتوں کو آزادی دو۔ کہ وہ اپنی اور قوم کی مصلحت کے موافق جو راستہ چاہیں اختیار کرلیں

پردہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل ہماری طرف سے پورے غور و فکر کے محتاج ہیں اگر ہم تقلید مغرب کے حامیوں کی باتیں سنکر لباس، معاشرت اور تمام باتوں میں فرنگی بنگئے تو وہ زمانہ دور نہیں جب زمانہ کے ہاتھوں ہم اپنی قومیت بھی کھو دینگے۔ اور دوسروں میں مضم ہوجائینگے۔ فطرت کا یہی قانون ہے کہ قوی کمزور کو ہضم کرجائے۔ میں اہلقلم حضرات کو دعوت دونگی۔ کہ وہ ان مسائل سے تغافل نہ برتیں اور تمدن میں ایسی فضا پیدا کریں جو ایکطرف مشرقی سہاگ کے موافق ہو اور دوسری طرف جدید تمدن سے استفادہ کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ کرے۔

شادی

ہمارے یہاں شادی کا طریقہ نہایت معیوب اور بیکار ہے۔ جس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی میں اتفاق اور موافقت نہیں رہتی۔ شادی کے موقع پر مرد کافی دولت خرچ کرتا ہے۔ کئی دن اور کئی راتیں جشن و مسرت میں گذاری جاتی ہیں لیکن یہ سب کچھ مرد کی طرف سے اس دلہن کیلئے ہوتا ہے۔ جس کو اس نے دیکھا تک نہیں جس کے اخلاق و عادات کا اس کو پتہ تک نہیں۔ اس کو جو کچھ اس کے متعلق معلوم ہے وہ صرف یہ کہ اس کا رنگ گورا ہے۔ وہ گداز جسم کی ہے۔ اس کے پاس دولت بھی ہے اور یہ اہم معلومات بھی پیغام لانیوالے کی زبانی سنکر حاصل ہوئے ہیں۔ اور پیغام لانیوالے بھی اپنی اجرت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اگر لڑکی والوں کی طرف سے کچھ زیادہ انعام واکرام کی توقع ہے تو وہ لڑکی کو منگیتر کی نگاہوں میں بلقیس جیسی دولتمند اور شیریں جیسی حسین ثابت کر دیتے ہیں۔ بہت سے نوجوان اس قسم کے فریب میں آکر کسی عورت کے مجبور شوہر بنجاتے ہیں۔

صرف پیغام لانیوالوں کے بھروسے پر جو شادیاں ہوتی ہیں ان میں ایسے خوش نصیب میاں بیوی بہت کم ہوتے ہیں۔ جن کی زندگی خلوص اور محبت کے ساتھ ہنسی خوشی گذرتی ہو۔ زیادہ تر تو اس قسم کی شادیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ شوہر اگر مناسب ہے تو بیوی احمق۔ جاہل۔ فضول خرچ اور نہ معلوم کن کن خوبیوں سے آراستہ ہوتی ہے اور اگر بیوی معقول ہے تو میاں بد اطوار۔ شرابی اور بدمزاج ہوتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں زندگی کے دن نہایت تلخی اور ناگواری میں گذرتے ہیں۔ الغرض شادی کو بھی ہم مشرقی لوگوں نے اپنے تمام کاموں کی طرح تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک شادی کا معاملہ اس لئے اور بھی معمولی ہو گیا ہے کہ شریعت ہمکو طلاق اور تعدّد ازدواج کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن کیا اس اجازت سے شارع علیہ السلام کا مقصد یہ تھا۔ کہ اجتماعی تعلقات کے نظام میں وہ ابتری کیفیت پیدا ہو۔ جو ہم آج دیکھتے ہیں۔ کیا یہ اجازت اس لئے ملی تھی۔ کہ خاندانوں میں تباہ کن انقلابات پیدا کئے جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دنیا میں شریعتوں کا وجود اس لئے نہیں آیا کہ انسانوں کو بدبخت بنائے۔ بلکہ وہ تو انسانوں کو سعادتمند اور خوش نصیب بنانے کیلئے آیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عربوں کی شادی اور منگنی کا طریقہ بہت بہتر اور شریفانہ تھا۔ اس لئے۔ کہ اس وقت مسلمانوں میں اس طرح کا پردہ نہ تھا۔ میں پوری قوّت کے ساتھ اعلان کردینا چاہتی ہوں کہ ہمارا اجتماعی نظام اور ہمارا پردہ غلط اصول پر قائم ہے۔ اور کوئی متمدّن قوم ان اصول کو اپنے دستور العمل میں شامل نہیں کرسکتی۔

کس قدر تعجّب کی بات یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں اور عورتیں عام سڑکوں پر یا بازار میں دوکانوں پر کھلے بند دوکانداروں سے، ٹراموے اور گاڑی چلانیوالوں سے گفتگو کریں مصوّر (فوٹوگرافر) کے سامنے غیر شریفانہ انداز و ہیئت میں کھڑی ہوں اپنی شوخی اور زینت کا اس کے سامنے اچھی طرح مظاہرہ کریں۔ یہ سب کچھ تو شرافت اور پردہ تصوّر کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی تعلیمیافتہ اور روشن خیال مرد شادی کے سلسلہ میں لڑکی کے باپ سے اس کی اجازت چاہے کہ وہ اس کی حاضری میں اسکی لڑکی کو دیکھنا اور اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے تو یہ ایک ناقابل برداشت ذلّت سمجھی جائے۔ دوکاندار۔ ٹراموے کا ملازم اور فوٹوگرافر سبھی مرد ہیں اور یہ خواستگار بھی مرد۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتی۔ کہ اُن کیلئے کیوں اجازت ہے اور اس کیلئے کیوں ممانعت؟

اور لطف یہ کہ اُن کی گفتگو والدین کی غیر حاضری میں ہوتی ہے۔ اور یہ والدین کی موجودگی میں باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ بھی اس شریف غرض سے کہ اپنی زندگی کا شریک اور اپنی اولاد کا مربی ملاحظہ کرے۔ اپنی اس جاہلانہ عادت کے متعلق ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہمکو پرانی رسم ورواج کی باتیں خواہ وہ ہمارے حق میں کتنی ہی بری ہوں ہر طرح پسند ہیں۔ اور ہم ان کو کسی حالت میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتے۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوجوانوں کے اخلاق زیادہ تر پست ہیں۔ اور اس لئے والدین کی غیور طبیعت انکو اپنی لڑکی سے گفتگو کا موقع اپنی موجودگی میں بھی نہیں دیسکتی۔ مگر جواب یہ ہے کہ کسی دوکان کے ملازم یا فوٹو گرافر کے اخلاق تو تعلیمیافتہ نوجوانوں سے بھی کہیں زیادہ پست ہوتے ہیں۔ پس اگر خطرات پر نظر رکھنی ہے تو اس کے مواقع وہ ہیں جہاں لڑکی آزادی سے نہیں بول سکتی ہے۔ جہاں اپنی زینت اور شوخی کی نمائش کر سکتی ہے نہ یہ موقع جو انتہائی سنجیدگی اور غیر معمولی وقار کا ہے۔ یہاں تو کسی طرف سے خطرے کا گذر ہی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنی اولاد کی شادی میں ان باتوں کا لحاظ رکھیں تو ان کے حق میں بہتری اور دور اندیشی ہوگی۔ اور میاں بیوی کے درمیان نا اتفاقی اور عداوت کے واقعات بہت کم ہوجائیں گے۔ بلاشبہ میاں بیوی کے مابین ناچاقی اور بغض کی وجہ زیادہ تر ہمارا وہ کورانہ طریق ازدواج ہے۔ جو ہم اپنی عزیز ترین متاع یعنے اولاد کی شادی کے سلسلہ میں اختیار کرتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ لڑکی کو صرف دیکھ لینا کافی نہیں بلکہ ہونیوالے شوہر کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں سے جو لڑکی کے حالات اور عادات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ صحیح صحیح معلومات حاصل کرلے۔ اور اس کے بعد بخوبی واقف اور مطلع ہو کر شادی کرے۔ لڑکی کے والدین پر لازم ہے کہ وہ بھی اس قسم کی پابندیاں اور پوری احتیاط سے اپنے دل کا اطمینان کرلیں اور اس کے بعد لڑکی کو دکھانے کا موقع

لائیں۔ اس لئے کہ ہر دیکھنے والا شادی کا طالب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر طالب میں معقولیت ہوتی ہے۔ دیکھنے والوں میں بہت سے مسخرے اور بداخلاق، محض مذاق اور بدظنینی کا مقصد پورا کرنا چاہیں گے۔ ہمارے موضوع سخن سے یہ آوارہ گروہ خارج ہے۔ ہمارے پیش نظر تو وہ نوجوان ہیں جو شرافت اور حسن سیرت کے مالک ہیں۔ بہرحال لڑکی کے باپ کو پہلے ہی تحقیق و تلاش کر لینی چاہیئے۔

یہاں پہونچکر میں اپنے ایک خیال کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جس سے ممکن ہے بعضوں کو تکلیف ہو۔ اور وہ یہ کہ ہمارے نوجوان ابتک عورتوں کے احترام سے خالی ہیں۔ یہ اجتماعی تربیت کا وہ نقص ہے جس کو بہت جلد دور کر دینا چاہیئے۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ کہ مرد ہمکو سجدہ کریں۔ مگر میں ان سے درخواست کروں گی۔ کہ وہ سڑکوں پر جبکہ بھیڑ ہو ہمارے لئے راستہ چھوڑیں۔ ہمکو اپنی طرح انسان سمجھکر دیکھیں۔ ہمارے لئے اشارات کرنا ترک کریں بیہودہ کلمات سے ہمارے کانوں کو تکلیف نہ دیں۔ اگر جانوروں اور گاڑیوں سے ٹکرا جانے کا خوف نہ ہوتا تو ہم شاید اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر باہر نکلتے۔ تاکہ ان کے ناقابل برداشت ذلیل الفاظ نہ سن سکیں۔ اگر میں باپ ہوتی تو اس قسم کے ننگ ملت نوجوانوں کو ہرگز داماد نہ بناتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کی یہی حالت ہے۔ خدا کے فضل سے ہمارے بہت سے نوجوان اخلاق اور شرافت کی راہ پر ہیں۔

دیکھ دکھاکر شادی کرنے پر ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بسا اوقات لوگ لڑکیوں کے دکھانے میں فریب سے کام لے سکتے ہیں۔ یعنے دکھائیں گے کوئی لڑکی، اور شادی کریں گے کسی اور لڑکی کی۔ مگر میں یہ پہلے عرض کر چکی ہوں کہ غیر شریف اور آوارہ گروہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ شریف اور غیر شریف کا پتہ اس کے حالات عادات اور معاملات سے فوراً چل جائیگا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک شخص اپنے تمام معاملات میں شریف ہو۔ اور لڑکی کی شادی کرنے کے معاملے میں یکایک اس کی طبیعت

کا رنگ بدل جائے۔ اور وہ فریبی اور مکار ہو جائے۔

ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو محض اس لئے کسی کا پیغام رد کر دیتی ہے کہ جو مہر وہ پیش کر رہا ہے وہ بہت قلیل المقدار ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عقلمند کون ہے۔ جو مال کے ذریعہ راحت خریدتا ہے۔ یا وہ جو راحت دیکر مال خریدتا ہے؟ اس میں کیا حرج ہے کہ ان کی لڑکیاں غریب ہی رہیں۔ مگر خوش نصیبی اور سعادت کی زندگی جییں؟ اکثر لوگ سب سے پہلے یہی چاہتے ہیں کہ ان کی لڑکیاں دولتمند رہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ خوش نصیبی اور سعادت مال و دولت کے تابع ہے۔ افسوس یہ لوگ کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

میاں بیوی میں نا چاقی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ پہلے سے وہ کسی اور کو اپنا شریک زندگی بنانا چاہتے تھے لیکن والدین یا رشتہ داروں کے جبر نے انکو اس کا موقع نہیں دیا۔ اور وہ اپنی مرضی کے خلاف میاں بیوی بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں دونوں کی زندگی عذاب میں ہوگی۔

اس قسم کے واقعات ایک ہی خاندان کے افراد میں یا پھر گہرے دوستوں کی جماعت میں بکثرت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کے ایک لڑکا ہے تو اب جہاں بھائی کے یا دوست کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ آپس میں یہ طے پا جاتا ہے کہ اس لڑکی کی ولادت اسی لڑکے کے نصیب سے ہوئی۔ اور یہ اس کی ہو چکی۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑکے کی تربیت کسی اور رنگ میں ہوتی ہے۔ اور لڑکی کا ماحول کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ اختلاف طبیعت مصیبت بنجاتا ہے اور جو کہیں لڑکے نے بڑے ہو کر کسی اور کو پسند کر لیا تو بس گویا قیامت آ چکی۔ جب تم کسی کے جبر سے کھانا نہیں کھاتے۔ کسی کے مجبور کرنے سے سوتے نہیں۔ تو پھر اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی پر کیوں جبر کرتے ہو؟ یہ ممکن ہے کہ تم نے جسکو پسند کیا ہے وہ حسین بھی ہو۔ اور دولتمند بھی۔ لیکن اگر اس کی طرف سے طبیعت میں نقص پیدا ہو چکا ہے

تو وہ دنیا بھر سے زیادہ بدصورت اور مفلس ثابت ہوگا۔ میاں بیوی میں اتفاق خوبصورتی اور دولت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے رغبت اور رجحان طبع کی ضرورت ہے۔
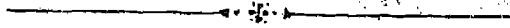
شادی کی عمر

جس طرح شادی میں اس امر کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ دونوں گھرانے برابر کے درجے کے ہوں۔ اور میاں بیوی مذہب اخلاق اور تعلیم میں یکسانیت رکھتے ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ ضروری شادی کی عمر کا لحاظ رکھنا ہے۔ شادی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت طرفین کی عمر کو حاصل ہے

لارڈ کرومر نے مصر کے متعلق اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ "یہاں کی ہر چیز وقت سے پہلے بلوغ کو پہونچ جاتی ہے" یہ جغرافیہ کی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس لئے کہ پودے۔ پھل انسان اور حیوان سبھوں کی نشو و نما ملک کے درجۂ حرارت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ کسی شے کے جلد یا دیر میں پختہ ہونے کیلئے جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ ان کے باوجود قدرت کا یہ قانون اپنی جگہ مسلم ہے۔ مصر میں لڑکیاں علی العموم بارہ ۱۲ برس یا زیادہ سے زیادہ تیرہ ۱۳ برس میں اگر ان کی صحت اچھی رہی بالغ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ یورپ اور دوسرے ممالک کی لڑکیاں سترہ ۱۷ اور اٹھارہ ۱۸ برس گذر جانے کے بعد بھی بسا اوقات سن بلوغ کو نہیں پہونچتیں۔ اس اصول پر شادی کی عمر کا قیاس ہم کو یورپین ممالک پر نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ جس طرح ہمارے یہاں سن بلوغ پہلے آتا ہے اسی طرح شادی بھی پہلے ہونی چاہیے۔ میں بعض اطبا کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتی جو اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ کہ سن بلوغ ہی کو شادی کی عمر قرار دیدیا جائے۔ اسلئے کہ بارہ ۱۲ برس کی لڑکی شادی کا مفہوم کیا سمجھے گی؟ اور امور خانہ داری سے کس طرح واقف ہوگی؟ اور پھر اگر وہ صاحب اولاد ہوگئی تو کیا کرے گی؟ میں خیال کرتی ہوں۔ کہ وہ ماں اور اس کی اولاد دونوں دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔ اگر ایام نفاس

میں نہیں تو پرورش کے زمانہ میں ان کی موت یقینی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جن لڑکیوں کی شادی کمسنی میں ہوئی۔ ان میں بکثرت اعصابی امراض کا شکار ہوئیں۔ اور جہالت نے ان امراض کو "اوپر کا فساد" بتا کر ہمیشہ کے لئے ان کا خاتمہ کر دیا۔

شادی کوئی معمولی بات اور مذاق نہیں ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں بلکہ بعض بڑی عورتیں بھی شادی کا مطلب صرف اسی قدر جانتی ہیں کہ مختلف قسم کے باجے بج رہے ہوں۔ پنڈال بنایا گیا ہو۔ ریشمی اور زرق برق لباس زیب تن ہوں اور ایک دھوم سی مچی ہو۔ میری چھوٹی بیگم! یہ شادی نہیں ہے۔ شادی تو نام ہے شوہر کو راضی رکھنے کا۔ اس کی دولت اور گھر کے انتظام کرنے کا۔ اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا۔ اور اس کی اولاد کی پرورش کرنے کا۔ کیا تم اس عمر میں یہ سب کام کرسکو گی؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔

ہماری مائیں اور دادیاں اپنے قصوں میں اپنی صغر سنی کی شادی کے نہایت مضحکہ خیز واقعات بیان کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تو تعویذ دکا ہار ان کے گلے میں موجود تھا۔ کیا کمسنی میں شادیاں کر کے ہم اُلٹے پاؤں ماں دادی کے عہد میں جانا چاہتی ہیں؟ خدا کی قسم باپ کے لئے حرام ہے کہ وہ اپنی لڑکی پر ظلم کرے۔ اور ایسے فرائض کی انجام دہی اس کے سپرد کرے جس کے ادا کرنے کی ابھی اس میں قوت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ باپ کیلئے حرام ہے کہ وہ اپنی جاہل بیوی کی خواہش پر اپنی بچی کو وقت سے پہلے زوجیت کے "تنگ قید خانے میں محبوس کر دے۔ ہاں ماں کیلئے حرام ہے کہ وہ اپنا حوصلہ نکالنے کے نام سے اپنی لڑکی کا پہلا ہی پیغام بلا غور و فکر کے قبول کر لے، شادی ایک مستقل غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور اس سلسلہ میں باپ سے زیادہ ماں قابل ملامت ہے۔ اس لئے کہ زوجیت کا اس کو ذاتی تجربہ ہے۔ اس نے اس راہ میں کافی مشکلات اور دشواریاں اٹھائی ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم نمائش اور ناموری کے خبیث

مرض میں مبتلا ہیں۔ اور اپنی شہرت کی خاطر دیدہ و دانستہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں اور لوگوں سے اس واہ واہ کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں نے اپنی بچیوں کی شادی بڑی ہی شان سے کی۔

شروع شروع میں شوہر بھی اپنی کمسن بیگم سے خوش رہتا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ناراض ہو جاتا ہے مگر اس ناراضی میں غریب بیگم بالکل بے قصور ہے جس عمر میں وہ ذمہ داری کے مفہوم تک سے نا آشنا تھی۔ اس کے سر پورے گھر کی ذمہ داری ڈالدی گئی۔ پھر بھلا وہ کس طرح شوہر کے حسب مذاق تمام انتظامات کر سکتی ہے؟ وہ تو شام ہی سے سو جائیگی اور دن چڑھے بیدار ہو گی۔ رات میں بچے کے رونے چلّانے کی اس کو اطلاع تک نہ ہوگی۔ اور اس طرح رو رو کر ہی بچہ اپنی چھوٹی سی اماں کی بے خبری میں دنیا سے رخصت ہو جائیگا۔ اور اگر رونے سے بچ رہا تو کسی دن بیگم نیند میں ایک کروٹ اسی پہ بدل دیں گی۔ اور اس طرح اس کا خاتمہ اپنے ہاتھوں کر دیں گی۔ بچے کیلئے شب بیداری اور رات میں دودھ پلانے کی ضرورت ہے۔ کیا ایک کم عمر لڑکی رات کی رات بچے کی پرداخت اور اس کے دودھ پلانے اور دیکھ بھال کرنے میں گذار سکتی ہے؟ کیا وہ اپنی توجہ اور عقل سے بچوں کی تکلیف اور درد کا پتہ چلا سکتی ہے؟ ہماری پیدائش اور اموات کے اعداد و شمار موجود ہیں۔ جو کھلے طور پہ بتاتے ہیں کہ مصر میں بکثرت بچے مرتے ہیں۔ اور اکثر ایسے امراض کا شکار ہوتے ہیں جن کا علاج نہیں۔ اور یہ ماؤں کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ پھر جہالت کے ساتھ کمسنی ملکر اور بھی غضب ڈھا رہی ہے۔

لڑکی چھوٹی عمر کی ہو یا بڑی۔ اگر اس کی شادی کسی ایسے لڑکے کے ساتھ کر دی گئی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اور محض اس لئے کر دی گئی ہے کہ وہ فلاں کا بیٹا ہے تو یہ بھی لڑکی کے لئے ایک عذاب ہوتا ہے۔ ایسے کتنے واقعات ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کہ خانگی اختلافات یا لڑکے کی بد چلنی کے باعث آخر بیٹے کو باپ کے

گھر سے الگ ہونا پڑا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی صنعت ذریعہ معاش نہیں تو اس کے سوا کیا ہوگا۔ کہ دونوں تنگی اور تلخ کامی کی زندگی جییں۔ یا پھر عورت کے خاندان میں جا کر وہاں کے لوگوں کے لئے بار خاطر بنیں۔

عمر کی وجہ سے میاں بیوی پر جو بدبختی آتی ہے اس کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ کوئی بڑھا۔ نوجوان عورت سے شادی کرلے۔ یا اس کے برعکس کوئی بوڑھی عورت نوجوان مرد سے شادی کرلے۔ اول تو یہ کہ نوجوانوں اور بوڑھوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اولاد بہت کمزور ہوتی ہے۔ یا سرے سے ہوتے ہی نہیں اور پھر کسی نوجوان عورت کے ساتھ بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کے ساتھ نوجوان مرد کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھکر جیسا کہ ہمکو بعض اوقات سڑکوں پر فرنگی نظر آتے ہیں کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی ہم خلاف واقعہ سہی مگر یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ عورت بڈھے کی لڑکی ہے۔ یا لڑکا ڈھی کا بیٹا ہے۔ اور جب خدا نے اپنی کائنات میں مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔ اور صاف و شفاف آسمانوں میں دشوار گذار پہاڑوں کی بے جوڑ صف نہیں کھڑی کی۔ تاریک اور کھردری زمین میں خوبصورت ستارے نہیں جڑے تو پھر ہم کیوں فطرت کے خلاف بے جوڑ اور مخالف اجزا میں اتحاد کرتے ہیں ؟

نوجوان عورت کے پیش نظر اپنی زینت ہوگی۔ اس کی ساری توجہ اپنی پوشاک کی درستی اور خوبصورتی پر مبذول ہوگی۔ وہ ہر وقت اس کی متمنی ہوگی۔ کہ سہیلیوں کے ساتھ رہے۔ اور بڑے میاں کا سارا اہتمام ناس کی ڈبیہ اور کھانسی کی دوا تک محدود ہوگا

الغرض میاں بیوی کی عمر کے تناسب پر باہمی محبت اور اتحاد وسلامتی کا دارومدار ہے لڑکی کی شادی اسی وقت کرنی چاہئے۔ جب وہ بیوی بننے کی پوری اہلیت رکھتی ہو۔ اور پوری اہلیت سترہ برس سے قبل کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتی۔ چھوٹی عمر میں شادی کر دینا یا میاں بیوی کی عمر میں بہت زیادہ فرق رکھنا اپنی جان پر عذاب کا دروازہ کھولنا ہے۔

وہ کونسی گھڑی ہوگی۔ جب قوم شادی کو دور اندیشی اور غور و فکر کی نگاہوں سے دیکھے گی۔ وہی وقت قوم کی ترقی اور سعادت کا وقت ہوگا۔ خدایا وہ گھڑی مجھے دکھائے کہ یہ میری عین تمنّا ہے۔

تعدّدِ ازدواج

یا

سوت

کس قدر خوفناک اور موذی کلمہ ہے۔ اس کے لکھتے وقت میرا قلم رکنے لگتا ہے عورتوں کے اس جانی دشمن نے کتنے ہی دلوں کو پامال، کتنی عقلوں کو دارفتہ اور کتنے ہی خاندانوں کو پراگندہ بلکہ برباد کر دیا۔ اس کے ظالم ہاتھوں نہیں معلوم کتنی معصوم جانیں نذرِ اجل ہو گئیں۔ اور کتنے بھائی آپس میں ایک دوسرے کے ہمیشہ کیلئے دشمن ہو گئے۔

یہ خوفناک کلمہ وحشت اور انانیت سے بھرا ہے۔ اس نے مردوں کو فریب دیا۔ ان کے اخلاق بگاڑے۔ ان کو مکر و فریب اور دروغ بانیوں کی تعلیم دی۔ اسی نے دلوں میں چغلی اور حسد کی تخم ریزی کی۔ جو دولت کسی اور کا رزق تھی۔ اسی نے اس کو دوسروں کے لئے پانی کی طرح بہایا۔

ہاں اے نئی دلہن لانیوالے! اس جدید لطف اندوزی کیوقت اس غم نصیب بیکس کی یاد بھی کر لینا جس کے دل و جگر میں رنج و الم کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اور اسکی حرارت سے اس کے چمکدار موتی آنسو بنکر آنکھوں کی راہ سے ٹپک رہے ہیں۔ ہاں اس نئی خوشی کے لمحوں میں اُن چھوٹے چھوٹے بچّوں کا خیال بھی رکھنا جو صرف اس لئے روتے ہیں کہ ان کی ماں روتی ہے۔

جس دیہات میں میرا قیام ہے وہاں تعدّدِ ازدواج کا بکثرت رواج ہے۔ اور مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ یہاں کی تمام عورتیں سوت کا تجربہ رکھتی ہیں۔ اور چونکہ

میری ان سے گہری راہ و رسم ہے اس لئے میں اس موضوع پر پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ عرض کروں گی۔

میں نے بہت سی عورتوں سے سوال کیا۔ کہ کیا تمکو اپنے شوہر سے ویسی ہی محبت ہے جیسی سوت کے آنے سے پیشتر تھی۔ سبھوں نے متفقہ جواب دیا کہ نہیں۔ اور بعضوں نے تو یہ جواب دیا کہ ہمارے شوہروں کے جنازے کاندھوں پر ہوں ہمکو گوارہ ہے۔ لیکن سوت کا وجود ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اللہ اللہ عورت کی ناراضی اور بغض کا یہ عالم ہے۔ عورتوں کی اس کیفیت پر مردوں کو غور کرنا چاہیئے۔

اور میں دیکھتی ہوں کہ نئی اور پرانی دونوں کا حال یکساں ہے۔ دونوں مغموم اور افسردہ خاطر ہیں۔ پہلی سے پوچھیئے کہ وہ کیوں رنجیدہ ہے؟ وہ کہتی ہے کہ میرے لئے یہ ذلت ناقابل برداشت ہے۔ میرا دل لوٹ چکا۔ میں اس نئی سے حسن و جمال میں، عادات و اخلاق میں غرض کسی بات میں کم نہ تھی۔ میں نے "ان کو" راضی رکھنے کیلئے مجھسے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ لیکن اب۔ اب تو میں کچھ نہیں کروں گی۔ اگرچہ وہ مجھے راضی رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ محبوب ہو۔ اور میں نے جو دوسری شادی کی ہے وہ اس لئے نہیں کہ تم میں کسی قسم کی کمی تھی۔ وہ تو ایک مقدر کی بات تھی جو ہو گئی۔

دوسری سے دریافت کیجیئے۔ کہ وہ کیوں ملول ہے؟ جواب دیتی ہے کہ میری زندگی میں کسی کا شریک ہونا میرے لئے سوہان روح ہے۔ اگرچہ وہ مجھے یقین دلاتے رہتے ہیں کہ پہلی کی مجھے بالکل پرواہ نہیں۔ اس کی پرواہ ہوتی تو تم سے شادی ہی کیوں کرتا؟ بار بار ارادہ کرتا ہوں کہ طلاق دیدوں، مگر اس خیال سے کہ وہ رہیگی تو بچوں کی پرورش کرے گی۔ اپنے ارادے سے باز آجاتا ہوں۔

دو بیویوں کا شوہر کس قدر حیلہ گر اور مکار ہوتا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے

کہ ایسوں ہی کو نوآبادیات کا ناظر مقرر کرنا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ ہماری کوئی نوآبادی نہیں ہے۔

عورت جب سوت کی بلا میں مبتلا ہوتی ہے۔ تو اس کی مسرت کا چراغ خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ کینہ اور حسد کی آگ روشن ہو جاتی ہے۔ پھر تو شیطان اسکو انتقام اور مکاری کے طریقے بتانے لگتا ہے۔ چنانچہ کتنی عورتوں نے اپنے شوہروں کو یا سوت اور اس کی اولاد کو زہر دیدیا۔ اور بالآخر سبھی گرفتار عذاب ہوئے۔ کتنی عورتیں شوہر کے پاس سوت کی چغلی کھانے اور لوگوں میں اس کی غیبت اور شکایت کرنے کی عادت بد میں مبتلا ہو گئیں۔ اور ایسی عورتوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں جو شوہر کا دل سوت سے پھیرنے اور اپنی طرف مائل کرنے کیلئے جادو۔ تعویذ اور گنڈوں پر اپنی دولت صرف کر چکیں۔ اور اپنے زیورات تک فروخت کر دئے۔

دو عورتوں کا شوہر جیسا کہ خود اس کو بھی محسوس ہوتا ہوگا۔ کوئی اچھی زندگی بسر نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی کسی ضرورت سے باہر گیا ہے تو کسی ایک کا یہ الزام قائم ہے۔ کہ دوسری کے پاس گئے تھے۔ اور اگر معاملہ اس الزام ہی تک رہتا تو بھی خیریت تھی۔ لیکن وہاں تو بدگمانی اور تنفر کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور جھنک ٹپک سے بھی ترقی کر کے بسا اوقات بدزبانی تک نوبت پہونچتی ہے۔ اگر بھول کر بازار سے ایک کے لئے کوئی چیز خریدی اور دوسری کے لئے خیال نہ رہا تو بس غضب ہو گیا۔ گھر پہونچتے ہی طعن و تشنیع کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت میں یہ شوہر کس قدر پریشان ہے اور کس قدر اس کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے؟

پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے والے کو میں اسی وقت معذور سمجھوں گی۔ جب وہ کسی شرعی یا غیر شرعی عذر سے پہلی کے ساتھ ہنسی خوشی کی زندگی بسر نہ کر سکتا ہو۔ اور اس بات پر مجبور ہو کہ دوسری شادی کر لے۔ لیکن دور اندیشی اور

عقلمند وہی ہے جو اپنی جدید مسرتوں میں اپنی پہلی بیوی اور اپنی اولاد کو فراموش نہ کر جائے اگر بیوی کا وجود اس کی زندگی میں تلخی پیدا کرنیوالا ہو۔ یا بیوی کے لئے شوہر کا وجود ناگوار ہو تو اس کو طلاق دیدینی چاہیئے۔ بہت ممکن ہے دونوں کو دوسرے راحت پہونچانے والے اور مخلص شریک زندگی ملجائیں۔

میرے خیال میں سوت کی مصیبت سے طلاق کی مصیبت بہت زیادہ ہلکی ہے، طلاق مصیبت ہے اور آزادی۔ لیکن سوت مصیبت ہے اور غلامی۔ پھر جب مصیبت بہرحال آنی ہے تو کیوں نہ عورت آزاد ہوکر مصیبت اٹھائے۔ کیوں وہ اپنا جی جلائے۔ اور اس پر مجبور ہوکر اپنے جی جلانے والے کو آنکھوں سے دیکھا بھی کرے؟ آزاد مغموم ہر حالت میں مغموم غلام سے اچھا ہے۔ بعض مرد پہلی بیوی کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ دوسری شادی کے بعد گھر کی مالکہ تم ہی رہو گی۔ تجوری کی کنجیاں تمھارے سپرد ہونگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ گھر میں گھی شکر پر حکومت کرنے سے کہیں تسکین ہولی ہے؟ تجوری کی کنجیوں کو شوہر کی محبت سے کیا تعلق اور ان کنجیوں سے کیا نسبت جن سے دل کھلجاتے ہیں؟

تعدد ازدواج۔ مرد کیلئے۔ صحت کیلئے۔ دولت کیلئے۔ اخلاق کیلئے۔ اولاد کیلئے اور سب سے آخر میں خود عورت کیلئے مفاسد اور خرابیوں کا سرچشمہ ہے۔ مرد کا ایک جدید خاندان سے تعلق پیدا ہوتے ہی اس کے مصارف میں اضافہ ہوجائیگا۔ اس کے علاوہ ہر عورت کوشش کرکے زیادہ سے زیادہ [illegible] خرچ کریگی۔ تاکہ سوت کیلئے کچھ باقی ہی نہ رہ جائے۔ اور لطف یہ کہ اس [illegible] کو [illegible] کرکے روکا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ دونوں یہ جواب دیں گی کہ میری کفایت شعاری [illegible] کیا فائدہ؟ [illegible] اپنے بہت سے مرغوبات ترک کرکے بچت کروں اور شوہر دوسری پر خرچ کردے تو کیا کروں گی۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ میں اپنی مرضی کے مطابق جتنا چاہوں خرچ کرتی رہوں۔ جس طرح میری سوت کرتی ہے۔ اس سے بڑھکر دولت کی خرابی اور کیا ہو سکتی ہے؟ [illegible] ہی اولاد کی خرابی تو وہ اس طرح کہ اول تو ان کی تعداد میں اضافہ

ہو جائیگا۔ اور یہ اضافہ اس گرانی کے زمانہ میں اگر مرد صاحب ثروت نہیں ہے تو مصیبت کبریٰ ثابت ہوگا۔ یقیناً آج کل کے زمانہ میں دو خاندانوں کی پرورش اور ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور پھر بچے بھی کس طبیعت کے ہوں گے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سوت اپنے بچوں میں سوت کے بچوں کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات لڑکپن سے پیدا کرتی ہے۔ "سوت کا لڑکا" مشہور مثل ہے۔ اب اس فضا میں تربیت پانے والی اولاد بڑی ہوکر خاندان کے لئے کن اخلاق اور خوبیوں کی ہوگی۔ اس کا فیصلہ خود کر لیجئے۔

تعدّدِ ازدواج سے شوہر کی اخلاقی خوبیوں کا اس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنی دونوں بیویوں کو یہ اطمینان دلانے کے لئے کہ اس کو ہر ایک سے محبت ہے۔ ایک زبردست حیلہ گر اور اعلیٰ درجے کا خوشامدی بننا پڑتا ہے۔

مجھے مسرّت ہے کہ روشن خیال اور تعلیم یافتہ طبقہ میں دن بدن تعدّدِ ازدواج کی رسم کم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تمدّن نے زندگی کو سراپا محنت اور مشقت بنا دیا ہے۔ ہمارے اسلاف دس بگیہ زمین کے مالک بن کر آرام سے زندگی اور دو دو تین تین بیویاں کر کے ان کے مصارف پورے کرتے تھے۔ اور آج تو حالت یہ ہے کہ سو بگیہ کا مالک پوری جد و جہد اور دن رات کی محنت کے بعد بھی ایک خاندان کی پرورش کرنے سے عاجز ہے۔

عورتوں کے چند عیوب

غلط غیرت

(۱)

سب سے پہلا تصور جو عورت کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ شوہر پر بے اعتمادی ہے
غریب شوہر اپنی صفائی اور بے لوثی کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے اور اپنے کو تہمت سے
بری کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے لیکن بیگم کی بدگمانی دل سے دور نہیں ہوتی۔ میاں
گھر سے باہر ہوئے، پھر خواہ وہ اپنے دفتر ہی میں کام کرنے کیوں نہ گئے ہوں۔ یا کسی دوست
کی دعوت میں شرکت کیلئے کیوں نہ نکلے ہوں۔ مگر واپسی پر دیکھتے ہیں کہ بیوی کا مزاج
برہم ہے۔ چہرے کا نقشہ بدل گیا ہے۔ غصے میں دماغی توازن برقرار نہیں ہے۔ بات
بات پر جھنک پٹک کر رہی ہیں۔ ان کو اپنے اس شبہ پر یقین ہو چکا ہے کہ کسی دوسری شادی
کی فکر میں گئے ہوں گے۔ یا کسی اور سے تعلقات پیدا کر رہے ہوں گے۔ اگر کسی دن دوستوں
کی مجلس میں دیر ہو گئی اور شب میں ذرا تاخیر سے مکان پہونچے تو بس سوالات پر سوالات کئے
جا رہے ہیں۔ اتنی دیر تک کہاں تھے؟ وقت پر کیوں نہیں آئے؟ ایک مصیبت یہ کہ
کہ اگر وہ غریب صحیح صحیح کہدے تو اس پر اعتماد نہیں کریں۔ یہی بے اعتمادی عورت
کے سامنے بسا اوقات وہ تمام خطرات پیش کر دیتی ہے جن سے وہ ڈرتی رہتی ہے۔ اسی
بے اعتمادی کی بدولت اکثر خیال حقیقت اور اندیشہ، واقعہ بن جاتا ہے۔ بیوی کی زبان
سے بار بار سن کر شوہر زندگی کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈالتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ

اس کو نہایت آسان اور نزدیک کی منزل سمجھنے لگتا ہے۔

جب شوہر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ وہ دوسری شادی بھی کر سکتا ہے یا کسی اور سے بھی اپنے تعلقات قائم کر سکتا ہے تو اب طرفین کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اس لئے۔ کہ سعادت اور بدبختی دونوں وہمی اور ذہنی چیزیں ہیں۔ میں اگر اپنے کو سعادتمند خیال کرنے لگوں تو عالم کائنات کی ہر چیز میرے لئے مسرت کا پیغام لانے والی محسوس ہو گی۔ میں زندگی کی تلخیوں میں حلاوت اور تنگیوں میں فراخی پیدا کر لوں گی۔ لیکن اگر میں اپنے کو بدبخت تصور کرنے لگوں تو دنیا کا ادنیٰ سے ادنیٰ حادثہ بھی میرے لئے مصیبت کبریٰ ہو گا۔ اور ہر چیز میں مجھے بدبختی نظر آئے گی۔ اس حقیقت کی مثالیں خصوصیت کے ساتھ جاہل عورتوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کا اعتقاد جب کسی بات پر پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کسی حالت میں اس کے خلاف ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتیں۔ خواہ ان کے اعتقاد کے خلاف واقعات ان کی نظروں کے سامنے ہوں۔ عورتوں کے اعصاب مردوں سے کہیں زیادہ جلد اثر پذیر ہوتے ہیں۔

بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو ہمیشہ افسردہ خاطر اور ملول ہی رہتی ہیں۔ حالانکہ ان کے رنجیدہ رہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوتی۔ ان کے بالمقابل بہت سی عورتیں ایسی بھی ہیں۔ جو ہر وقت ہشاش بشاش ہی رہتی ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی تلخیوں اور ناکامیوں سے گھری رہتی ہے۔ اس کی وجہ صرف خیال اور اعتقاد ہے۔

بیوی جب اپنے شوہر سے بے اعتماد ہو جاتی ہے۔ تو شوہر کے دل سے بھی اس کا اعتماد جاتا رہتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے بدظن رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ زندگی کس قدر تلخ اور مکروہات سے بھری ہو گی۔ کہ بظاہر تو دونوں متحد ہیں لیکن اندرونی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

یہاں پہنچکر عورت تعویذ، گنڈے اور منتروں سے کام لینا چاہتی ہے۔ خود تو کمزور

تھی ہی مقابلہ کے لئے جس تلوار کا انتخاب کیا وہ بھی کند اور بیکار نکلی۔ عورت کیوں اس بات کا یقین کرتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے خلوص اور محبت نہیں رکھتا؟ وہ کیوں نہیں سمجھتی کہ جس طرح اس کو اپنے شوہر سے اخلاص ہے بعینہٖ اسی طرح شوہر کے دل میں بھی اخلاص ہے۔ جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتی۔ کیوں اپنے شوہر کے خلاف بدگمانی کے خیالات دل میں لاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بدگمانیوں میں یقین کا رنگ خود اسی کی زبان نے پیدا کیا ہے، وہ بار بار صبح شام، دوپہر، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ غرض ہر وقت بے اعتمادی اور بدگمانی کا تذکرہ کرتی رہتی ہے۔ شوہر کو اس سے روحانی کوفت اور قلبی صدمہ ہوتا ہے۔ ایک تو موضوع کلام ہی بڑا شریر تھا۔ اس پر بار بار کے ذکر، اور جا و بیجا اظہار نے اور چاشنی کا اضافہ کر دیا۔ اچھی بات دس مرتبہ کہی جائے تو کانوں کو ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ پھر بھلا ایک بیہودہ تہمت اور بے اعتمادی کا جیسا الزام کوئی کب تک سن سکتا ہے۔ اب جبکہ شوہر بیوی کے الزامات سے تنگ آچکا ہے اور الزامات کی تردید اس لئے بےسود ہے کہ بیوی کسی بات پر اعتبار ہی نہیں کرتی۔ تو شوہر کے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر دم بیوی کے پاس ہی بیٹھا رہے۔ دوسرا یہ کہ دن بھر باہر پھرتا رہے۔ جہاں جہاں اس کا جی چاہے جائے اور رات میں آکر بیوی کی بکواس اور الزامات سن لینے کی عادت ڈال لے۔ محبت اور سعادت کا واسطہ، بتاؤ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اس مکروہ اور ناگوار زندگی کا اصلی سبب وہی غلط غیرت ہے۔ اور کچھ نہیں۔ غیرت انسان میں ایک قابل تعریف جذبہ ہے اس سے انسان کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس عورت میں غیرت نہ ہو اس سے پتھر اچھا۔ لیکن غیرت کے غلط استعمال سے عورت اور مرد دونوں بدبخت ہو جاتے ہیں۔

ہماری غلط غیرت کی تو یہ حالت ہے کہ کوئی شوہر اپنی جاہل عورت کے سامنے کسی بوڑھی عورت سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی چھوٹی لڑکی سے ہنس بول سکتا ہے

اور اگر کبھی کوئی بیوہ اپنا کوئی کام کسی مرد سے کرانا چاہے جس کو اس سے زیادہ اچھی طرح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو اس کی بیوی کی نظروں میں یہ ایک ناقابل معافی جرم ہوگا۔

میاں بیوی میں اعتماد ہونا کس قدر خوشگوار اور مسرت بخش ہے۔ خواہ یہ اعتماد جھوٹا ہو۔ اور اس کی بنیاد صحت پر نہ ہو۔ اس لئے کہ عورت جب اپنے شوہر کو بدچلن دیکھتی ہے تو اب اس کے لئے اس کے سوا کیا چارہ کار ہے کہ یا تو اس سے طلاق حاصل کرے یا اسی کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی خوشگوار بنانے کی کوشش کرے، طلاق حاصل کرنا تو مصیبت خریدنا ہے۔ اگر وہ دوسری صورت اختیار کرے اور شوہر کی محبت اور اولاد کے تعلق کی وجہ سے اسی کے ساتھ ہنسی خوشی سے رہنا پسند کرے تو اس کے لئے مناسب ہوگا۔ ایسی حالت میں عورت کو اپنے دل میں فرض کر لینا چاہیے۔ کہ شوہر کے دل میں واقعی اسکی محبت ہے۔ اور وہ جو گھر سے باہر رہتا ہے، تو اس لئے کہ اس کا اور گھر والوں کا مستقبل خوشگوار ہو۔ مجھکو یقین ہے کہ کسی مخلص خاتون کا یہ فرض کر لینا بہت آسان ہے اور اس کے لئے سکون اور اطمینان کا باعث بھی۔

شوہر کے رشتہ داروں سے نفرت

(۲)

عورتوں کو جن باتوں سے بڑی خوشی ہوتی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کے شوہر کا کوئی رشتہ دار نہ ہو۔ چنانچہ پیغام لانیوالے جھوٹ یا سچ سب سے پہلی خوبی یہی گناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کا اکیلا ہے۔ خدا کی پناہ! ایک فرد کی شادی کے لئے پورے خاندان کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ انسان طبعی طور پر دوسروں کا محتاج ہے۔ یہ فطرت کی طرف سے مجبور ہے کہ دوسروں سے میل جول رکھے۔ اپنے

تعلقات بڑھائے۔ عورت کی طرح مرد کی عزت بھی رشتہ داروں سے ہے۔ تعجب ہے
کہ عورت جبتک لڑکی رہتی ہے رشتہ داروں کے تعلقات اور ضرورت سے اچھی طرح واقف
رہتی ہے۔ اور بیوی ہونے کے بعد اس کو وہ بھلا دیتی ہے۔ ورنہ کیوں وہ خود بھی شوہر کے
رشتہ داروں سے متنفر رہتی ہے۔ اور شوہر کو بھی مجبور کرنا چاہتی ہے کہ اپنے رشتہ داروں سے
بیزار رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عورت یہ سب کچھ اس لئے کرتی ہے کہ کسی طرح حکومت کی
لگام اسکے ہاتھ میں آجائے۔ وہ چاہتی ہے کہ دو چیزیں بلا شرکت غیرے اس کے قبضہ میں
ہوں۔ گھر اور شوہر کا دل۔ وہ خیال کرتی ہے کہ اگر شوہر اکیلا رہا تو یہ دونوں چیزیں نہایت
آسانی سے اس کے تصرف میں آجائیں گی۔ اور اگر ساس و نند کا ساتھ رہا تو بس معرکہ جنگ
ہے۔ پھر تو باہمی بغض و عداوت کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے
ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دونوں چیزیں اسی کے قبضے میں آجائیں اور سب
سے پہلے میاں کا دل ہاتھ میں لینے کا جہاد شروع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں فتح حاصل
کرنے کے بعد بلا کسی بڑی دشواری کے گھر پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں فریقین کچھ نہ
کچھ حق پر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ ساس یا نند بالکل بے قصور اور بیگم
سراپا قصور وار ہوں۔ اگر ان کو حقیقت کا علم ہوتا۔ تو ان میں سے ہر ایک میاں کی محبت
سے اپنے حصے پر قناعت کر لیتی۔ اولادی محبت اور ہے اور ازدواجی محبت اور، اگر کوئی
عورت ان دونوں پر اپنا ہی تسلط چاہتی ہے تو وہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہی ہے
اور غلطی میں مبتلا ہے۔

عورت اگر یہ چاہتی ہے کہ شوہر اپنی ماں کا احترام نہ کرے۔ اس سے محبت نہ
رکھے اور اس کی ضروریات زندگی کی اگر وہ محتاج ہے کفالت نہ کرے تو وہ خطاکار
ہے۔ اور شوہر کی بدخواہ۔ اسی طرح ساس اگر چاہتی ہے کہ گھر میں بہو پتھر کی ایک مورت
بنی بیٹھی رہے۔ وہ اس کو شوہر کے سامنے تبسم کرنے پر بھی سختی سے ڈانٹے ڈپٹے

تو یہ ساس کا انتہائی ظلم اور سنگدلی ہوگی

آج کل کی عورتیں پہلے زمانے کی سی نہیں ہیں۔ زمانے کے اختلاف نے ان کی طبیعتوں اور ان کے خیالات میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب اگر نئے خیالات کی عورتوں کو پرانے خیالات کی ساسوں اور نندوں سے پالا پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیئے ؟ لڑنا جھگڑنا تو کچھ مفید نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اور پھر ہر دم کی تو تو۔ میں میں شریفوں کی عادت نہیں۔ تہذیب یافتہ اور عقلمند خواتین ایسے مواقع پر نہایت خوبی کے ساتھ اختلافات کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ اور دوسروں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ کہ ان میں کچھ اختلاف تھا۔

نرمی، چشم پوشی، اور درگذر عورت کے وہ اوصاف ہیں جن کی رعایت سے سارا کام بن سکتا ہے۔ عورت کسی چیز کو داہنی جانب رکھنا چاہتی ہے۔ ساس یا نندیں چاہتی ہیں کہ بائیں جانب رکھی جائے۔ اس وقت عورت کو درگذر سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ چھوٹی ہے۔ اس کو اپنی رائے ایسے مواقع اور معاملات میں پیش کرنی چاہیئے جن میں وہ پسندیدہ ہو۔ یاد رکھو نرمی اور منکسر المزاجی سے تمام اختلافات دور ہو سکتے ہیں اور غرور و سرکشی کے ہاتھوں تمام کام خراب اور برباد ہوں گے۔ تم کو سرکشی اور خودی چھوڑ کر ساس اور نندوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

شوہر کیلئے سب سے زیادہ پیچیدہ وہ جھگڑا ہوتا ہے جس میں ایک طرف والدہ ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف بیوی۔ شوہر کو یہ خیال ہوتا ہے کہ بیویاں تو بہت سی مل سکتی ہیں۔ اس لئے اکثر بیوی کے حق بجانب ہونیکے باوجود وہ اس کے خلاف ہی فیصلہ کرتا ہے۔

وہ عورت جو شوہر کے گھر میں آتے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو اس سے جدا کر دے حقیقت میں عورت نہیں شیطان رجیم ہے۔ اس کو یاد کرنا چاہیئے۔ کہ وہ تو ابھی دو دن سے آئی ہے۔ اور جن لوگوں کو جدا کر رہی ہے ان میں وہ لوگ ہیں

جنھوں نے اس کے شوہر کی پرورش میں ہر قسم کی مصیبتیں اٹھا کر اس کو پالا، بڑا کیا۔ اس کے عزیز دل ہیں وہ لوگ ہیں جو اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور اس کے پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار ہیں۔ اور تعجب ان بوڑھیوں پر ہے۔ جو آج بہو سے اپنی محبت کی امید رکھتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی نے اپنی ساس اور نند سے اپنے زمانہ میں کبھی محبت نہیں کی پھر جیسا بو چکی ہیں ویسا کیوں نہیں کاٹتیں؟

بچّوں کی حالت پر ایک نظر ڈالنے سے تمکو معلوم ہوگا۔ کہ ان کو چچا کی اولاد سے کہیں زیادہ خالہ کی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ عورت اپنے رشتہ داروں سے محبت رکھتی ہے۔ اور شوہر کے رشتہ داروں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے بچّوں کا تعلق چچا اور اس کی اولاد سے بہت قریبی ہے اور خالہ کی اولاد سے تو دور کا رشتہ ہے لیکن تنہا ماں کی کراہت اور بیزاری نے سب کو متاثر بنا دیا۔ اور نزدیک والوں کو کوسوں دور کر دیا۔ اور شوہر کے رشتہ داروں سے نفرت رکھ کر شوہر کی محبت کا دعویٰ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر اس دعویٰ میں کچھ بھی صداقت ہوتی تو شوہر کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی عورت کو محبت ہوتی۔ اور شوہر کی محبت میں ہر مصیبت برداشت کرتی۔

دو ہی باتیں ہیں جن کے لئے گھروں میں جنگ اور دلوں میں بغض و حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ ایک تو یہ کہ گھر پر کس کی حکومت ہو۔ دوسری یہ کہ مرد کے دل پر حکومت کون کرے؟ ہر عقلمند بیوی کو خوش ہونا چاہیئے۔ کہ وہ محبّت جو زوجیت کی بنیاد پر اس کو ظاہری طور پر شوہر سے حاصل ہے اس محبت سے بالکل الگ ہے جو شوہر کے رشتہ داروں کو اندرونی اور فطری طور پر ہوتی ہے۔ دونوں کے اوصاف اور علامات جدا ہیں۔ لیکن ہر ایک کی اہمیت یکساں ہے۔

مہذب خواتین کا فرض ہے کہ وہ اپنے جوش اور تیزی میں تھوڑی سی کمی گوارہ کریں اور گھر کی قدیم حکمراں کو اختیارات دینے میں بخیلی سے کام نہ لیں۔ اس لئے کہ جس کو

حکومت کی عادت ہوچکی ہو وہ محکومی برداشت نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ساس اور گھر کی بوڑھیوں پر لازم ہے کہ ہر بات میں وہ اپنے پرانے خیالات کی گاڑی آگے نہ کر دیا کریں۔ ہر زمانے کا رنگ الگ ہوتا ہے۔ اور ہر زمانے کی اصلاحات پہلے زمانے سے جدا ہوتی ہیں۔ گھر کی ذمہ داریوں اور اولاد کی تربیت میں حصہ لینے سے توان کے لئے یہی اچھا ہے کہ اپنے اوقات عزیز نماز اور روزہ میں صرف کریں۔ اس عمر میں عبادات کا انہماک دنیا میں بھی ان کیلئے مفید ہوگا۔ اور آخرت میں بھی نفع بخش۔

زود رنجی اور جدائی کی دھمکی

(۳)

میاں بیوی کا سچی محبت کے ساتھ اتحاد ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔ اور ہم اسی نعمت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ دنیا میں انسان خواہ کیسی ہی کامیابی حاصل کرلے اور اپنے کو کتنا ہی بڑا خوش نصیب تصور کرنے لگے۔ لیکن اگر وہ اس نعمت سے محروم ہے تو اس کی کامیابی اور خوش قسمتی ناقص ہے۔ وہ مفلس جو آج لکھپتی بن چکا ہے، وہ علامہ جس کے نظریات کی دنیا بھر میں شہرت ہوچکی ہے۔ وہ خاتون جس کے پاس دنیا کے نفیس ترین زیورات وجواہرات موجود ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی کامیابی پر خواہ کتنا ہی خوش ہولیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ازدواجی محبت سے ان کا دل خالی ہے توان کی سعادت ادھوری اور ان کی کامیابی ناتمام ہے۔ اس لئے۔ کہ انسان اپنے ارادے میں چاہے جتنا قوی ہو۔ لیکن اگر اس کا قلب کسی پریشانی میں مبتلا ہے تو وہ اپنا کام بخوبی انجام نہیں دےسکتا۔ میاں بیوی میں سے ایک اگر زندگی تلخ کردے تو دوسرے کو انتہائی ایذا پہونچانیوالی الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔

عورت مرد میں ناگواری اور ناچاقی کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے۔ کہ عورت چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجیدہ ہوکر اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ ادنیٰ سا واقعہ ہوا کہ بیگم کی سواری چلی۔ جس طرح بعض مرد بات بات پر طلاق دیدینے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں اسی طرح بعض عورتیں بھی خفیف سی وجہ پر گھر سے باہر ہو جاتی ہیں۔ عورت اور مرد غصے میں ایک دوسرے کو جدائی کی دھمکی دیدیتے ہیں۔ تاکہ مقابل کے دل میں خوف پیدا ہو۔ لیکن شاید ان کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا۔ کہ انتہائی غصے کی حالت میں دھمکی بےسود ہوتی ہے۔ اور مقابل بلا کسی غور و فکر کے فوراً دھمکی پر عمل کرنے کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے موقع پر انسان میں خودداری اور عزت نفس کا جذبہ کچھ اسطرح مشتعل ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی سزا بھی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور وہ اپنی بہتری اور بھلائی کی طرف سے دونوں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

وہ عورت جو ذری ذری باتوں پر جدائی کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ اگر غصے کی حالت میں شوہر اس کو طلاق دیدیتا ہے، پھر تو امید کے خلاف اس کو جدا ہونا پڑتا ہے۔ اب تک جدائی کے لئے بیچینی کا اظہار کرتی رہی۔ مگر اس کے بعد اس لئے بےچین ہے کہ پھر کسی طرح اسی کے پاس پہونچے۔ اس قسم کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ اور اپنی حماقت اور نادانی سے کتنی عورتوں نے آباد خاندانوں اور خوشحال اولاد کو برباد اور پراگندہ کر دیا۔

ماں باپ یا رشتہ دار شادی کر دینے سے پہلے لڑکی کے مستقبل اور اس کی خوشگوار زندگی کا ایک نقشہ اپنے تخیل میں جما رکھتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ اسی نقشہ کے مطابق وہ اپنے گھر جاکر زندگی بسر کریگی۔ اب اس کے لئے اس سے بڑھکر اور کونسی سعادت ہوگی۔ کہ وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کی امیدیں پوری کر دے۔ شوہر کی شکایتوں اور شوہر کے رشتہ داروں سے پرخاش کر کے وہ اپنے والدین کو خوش نہیں کر سکتی بلکہ

الٹے ان کی زندگی بھی تلخ کردیگی۔

ہمکو اپنے تمام جذبات اور جوش کے اظہار میں صبر اور برداشت کا دامن ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ ہم تو اپنے گھروں میں بیٹھی باہر سے آنیوالی عورتوں سے ملاقاتیں کر رہی ہیں۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ اسباب کی صفائی اور برتنوں کی ترتیب دیجارہی ہے اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں۔ یہاں لیٹتی ہیں۔ وہاں بیٹھتی ہیں، ادھر سے جاتی ہیں اُدھر سے آتی ہیں۔ ہم کیا اندازہ لگا سکتی ہیں کہ غریب شوہر کی جان کس مصیبت میں ہے، آج کس کس نے سخت کلامی کی۔ اشیاء خوردنی کی گرانی اس پر کیا اثر کررہی ہے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے معاش کی کوئی صورت پیدا ہوئی کہ نہیں، وہ اگر تنہا ہوتا تو تھوڑے پر بھی قناعت کرلیتا۔ لیکن اپنی ماں اور بچوں کیلئے کیا کرے۔ اپنے دل اور جگر کے ٹکڑوں کو کہاں سے کھلائے۔ کیا ان کو بھوکا چھوڑ دے۔ حالانکہ وہ خوش حالی کے عادی ہیں۔ جس کی یہ حالت ہو اور جو اس لئے شب و روز پریشان رہے کہ ہمکو خوشی نصیب ہو۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اس سے ترشرو ہوکر ملیں اور جب سامنے آئیں تو ناک بھوں چڑھائے اور ماتھے پر شکن ڈالے۔

کبھی کبھی عورت اس لئے گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے کہ اپنے میاں کی محبت کا تجربہ کرے۔ وہ چاہتی ہے کہ کسی نئے عنوان سے اپنی محبت کا اثر دیکھے۔ لیکن اس کو اس خطرناک تجربہ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کے شوہر کو اس سے کتنی محبت ہے؟

کبھی عورت کسی زیور یا کپڑے کی خاطر خفا ہوجاتی ہے۔ اور شوہر سے وہ زیور یا کپڑا لے کر صلح ہوجاتی ہے۔ عورت کس قدر بیوقوف اور کم عقل ہے۔ کہ اس قسم کی عارضی چیزوں پر اپنی اور اپنی اولاد کی راحت وسعادت قربان کردیتی ہے۔

جس طرح شوہر گھر کی بنیاد ہے اسی طرح عورت گھر کی رونق ہے اب اگر عورت

گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ تو وہ اپنے ہاتھوں اس کی رونق برباد کرتی ہے اور ساتھ ہی دلاؤ کے لئے غم کا سامان بھی جمع کرتی ہے۔ پھر نوکروں اور ماماؤں کے ہاتھوں جو نقصانات ہوں گے وہ مزید براں۔

جھوٹ بولنا یا باتیں بنا کر ملمع سازی کرنا نہایت دشوار گذار اور غیر محفوظ راستہ ہے۔ اس لئے عورت کو ایک مرتبہ طے کر لینا چاہیئے۔ کہ اس کو اپنے شوہر کے ساتھ رہنا ہے۔ مسرت کے دن آئیں چاہے مصیبت کے وہ ہر حال میں اس کی شریک زندگی رہے گی۔ وہ کسی کی ذری سی غلطی سے چراغ پا نہیں ہو جائیگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ شوہر اپنی غلطی پر نادم ہوگا۔ اور معافی چاہے گا۔ پھر تو دونوں ایک دوسرے سے چشم پوشی کرینگے۔ اور آپس کے ہر اختلاف کو مٹا دیں گے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس کو غصے میں آ کر طے کر لینا چاہیے کہ ایسے بد اخلاق اور کٹر شوہر کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔ اس کے بعد اپنے گھر چلی جائے۔ اور پھر شوہر کا منھ نہ دیکھے۔ اب رہا بار بار آنا جانا تو یہ ایک بیہودہ طفلش کی بات ہے جو عقلمند خواتین کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔

فضول خرچی اور مقابلہ کی عادت

پہلے کے لوگوں میں اور آج کل کے لوگوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں نہ انسان کی ضرورتیں اتنی زیادہ تھیں اور نہ چیزیں اس قدر گراں۔ اس کے علاوہ ایک فرق اور ہے۔ معلوم نہیں لوگوں کی نظر وہاں تک پہونچی۔ کہ نہیں۔ اور وہ یہ کہ پہلے زمانہ میں ہر طبقہ کے لوگ امیری اور غریبی کے اعتبار سے اپنی ایک حد رکھتے تھے۔ اور اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اُس وقت کا غریب فقیری میں مست تھا۔ اس وقت کا متوسط درجے کا آدمی امیروں کی سی زندگی جینا نہیں چاہتا تھا۔ جیسا کہ آج ہم چاہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے کے لوگوں کے اخلاق میں یہ آزادی نہ تھی اور بری طرح مجبور تھے۔

آج ایک خاندان کے مصارف بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے۔ کہ ضرورتیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اور ہر چیز کی قیمت ضرورت سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ زندگی کی ضرورتوں میں تو اس لئے اضافہ ہو گیا۔ کہ ہم اپنے سے زیادہ دولتمندوں اور امیروں کا ساٹھاٹھ باٹ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی کی ضروریات میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا ہے جو کسی بڑے رئیس اور صاحب ثروت کیلئے ضروری تھیں۔ ہمکو ایسا کرنے پر دو چیزوں نے مجبور کیا۔ شخصی آزادی اور فیشن پرستی۔ آزادی تو خیر اللہ کی ایک نعمت اور رحمت ہے۔ لیکن فیشن پرستی اور دوسروں کی ریس میں اتنا غلو کہ اپنی بربادی کا سامان کر لیا جائے۔ تو یہ کسی طرح معقول نہیں۔ البتہ اگر ڈارون کے نظریہ کی تائید کرنی ہے تو یہ تقلید مناسب ہو گی۔ مگر غالباً ہم اپنے لئے یہ رجسٹرڈ کرالینا پسند نہیں کریں گے۔ کہ تنہا ہمیں بندروں کی نسل سے ہیں۔

ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کو اگر ہم نظر انداز کر دیں۔ تو باقی ہر طبقہ کی خواتین ہم کو

یکساں نظر آتی ہیں۔ ہر ایک کا لباس، زیور تقریباً ایک قسم کا ہے۔ ہر ایک کے گھر میں اتنے ہی خادم اور ویسے ہی اسباب، تو کیا ہم سبھوں کو ایک درجے کی دولتمند سمجھ لیں؟ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جن کی آمدنی کم ہے ان کیلئے مصارف کہاں سے آئیں؟ جواب بہت مختصر ہے۔ ابّا دیں۔ یا میّاں لائیں۔

ہم میں سے اگر کسی کی شادی کے دن آئے۔ تو عورتیں مرد کو ناقابل برداشت خرچ پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ فلاں سے اس کا جہیز کم نہ ہو۔ اگر میاں حیثیت والے ہیں تو خیر۔ لیکن اگر جیب خالی ہو چکے ہیں تو دوسروں سے قرض لے لیتے ہیں۔ شادی کے کپڑوں میں اگر اس کی سہیلیوں نے دس جوڑے لئے ہیں تو یہ اس سے ایک جوڑا بھی کم کرنا نہیں چاہتی۔ اگر کسی کے گھر پانچ لڑکیاں ہیں۔ جن میں بعض یورپین بھی ہیں تو اب اس کو کسی طرح چین نہیں آتا۔ کہ اس کے گھر صرف ایک مصری خادمہ ہے۔ اگرچہ وہ اکیلی اس کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح وہ تمام معاملات میں اپنے کو دوسروں کے ترازو میں تولتی رہتی ہے۔ اب اگر وہ کسی غیر معمولی جائداد کی مالک نہیں ہے تو آخر میں شوہر کو مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ اس کے مصارف پورے کرے۔ اس غریب کے پاس اکثر اس کی ماہوار مزدوری کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس کو وہ خرچ کرتا ہے۔ اگر حساب برابر ہوتا رہا اور آئندہ ماہ کی مزدوری اسی ماہ خرچ ہو کر مقروض نہیں ہو گیا تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ لیکن جو کہیں مزدوری جاتی رہی، ملازمت چھوٹ گئی یا بیماری کی وجہ سے کچھ زیادہ خرچ آ گیا تو بس اب اللہ کی رحمت کے سوا کسی کا سہارا نہیں۔

دوسروں سے مقابلہ کرنے کا جذبہ حسد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور حسد عورت کے دل و جگر کو بے چین کئے رہتا ہے وہ کسی کو اپنے سے زیادہ خوبصورت اور مالدار دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ اسی کوشش میں رہتی ہے کہ محلسوں میں اسی کو امتیاز

حاصل ہو۔ لوگ اسی کی طرف انگلیاں اٹھائیں۔ وہ اپنے متعلق اس تذکرے سے مست ہوجاتی ہے کہ صاحب ثروت ہے۔ جائدادوں کی مالک ہے۔ اس کے بہت سے ملازم اور ماما ئیں ہیں۔ اس کے نہایت خوبصورت ٹم ٹم ہے بعض عورتیں اپنے زیور یا جائداد کا ایک حصہ محض اس لئے فروخت کردیتی ہیں کہ ایک اعلیٰ درجے کا موٹر خریدیں اور یورپ کا سفر کریں۔ یہ سفر اس لئے نہیں کہ بیگم سیاحت کی دلدادہ ہیں۔ یا سیاحت کے فوائد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ اس لئے۔ کہ فلاں خاتون نے ایسا کیا تھا۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا۔ کہ کسی معاملے میں بھی اعلیٰ اور اوّل رہنے کی کوشش انسان کے لئے معقول نہیں۔ اس لئے کہ اپنی جس بات پر بھی ہم فخر کرنا چاہتی ہیں ہمکو اس سے زیادہ قابل فخر باتیں دوسروں میں نظر آجاتی ہیں۔ ایک خاتون انتہائی تلاش اور انتہائی قیمت ادا کرکے قاہرہ کا سب سے زیادہ خوبصورت ہار خریدتی ہے۔ اور فخر کرتی ہے کہ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں لیکن ابھی اس فخر کی عمر دو چار ہفتے سے بھی زیادہ بڑھنے نہیں پاتی۔ کہ ایک دوسری خاتون نظر آتی ہے۔ جس کے گلے میں اس سے بھی زیادہ نفیس ہار ہوتا ہے۔ جس کو وہ آستانہ یا پیرس سے خرید کرلائی ہے۔ انسان اسی طرح اگر دوسروں کی چیزیں دیکھتا رہے گا۔ تو کبھی اپنی چیزوں پر قناعت نہیں کرسکتا۔

فیشن پرستی اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے حالات اور عادات میں تبدیلی کسی طرح بھی عقلمند خواتین کیلئے مناسب نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ باخبر اور تعلیم یافتہ عورتیں بجائے دوسروں کی نقل اتارنے کے کیوں نہ اپنے لباس اور اپنے گھروں میں جدت پیدا کریں۔ تاکہ دوسرے ان کی تقلید پر مجبور ہوں۔

حدیث شریف میں آیا ہے" کہ انسان اختلاف درجات کی برکت سے ہے" کس قدر بلیغ حکمت سے بھرا ہوا کلمہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا بھر کے اجتماعی نظاموں اور عمرانی قانونوں کا لب لباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان مبارک ہے۔

آج اگر تمام ماہرین اقتصادیات اور تمام علمائے اجتماعیات اپنے دماغ صرف کر کے قوانین مرتب کریں۔ اور بنی آدم کی بھلائی کے لئے ایک متفقہ نظام پیش کریں تو میں دعویٰ سے کہتی ہوں کہ اس مختصر حدیث سے زیادہ بہتر باحکمت اور دنیا کیلئے منظم ان کا نظام نہیں ہوگا۔ تمام دنیا کے انسانوں میں کلی مساوات نہیں ہو سکتی اور اس لئے افسوس کہ ہم سب کی سب دولتمند نہیں ہو سکتیں۔ ہم سب چاہتی ہیں کہ دولتمندوں کی طرح زندگی بسر کریں لیکن غریبی کوئی معیوب بات نہیں۔

صرف غریب ہونے کی وجہ سے انسان اپنی بلندی سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ اسلئے کہ اعتبار کے قابل اس کی ذاتی خوبیاں اور کمالات ہیں۔ نہ کہ خوش حالی یا تنگدستی۔ اگر میں اپنی سہیلی سے زیادہ غریب ہوں یا میری سہیلی مجھ سے زیادہ مفلس ہے تو اس سے انسانی اجتماع میں کیا خرابی پیدا ہو جائیگی۔ اور یا اگر میں اپنے سے اونچوں کی سی حالت بنانی چاہوں، حالانکہ مجھ میں ان کی تقلید کی حقیقت میں گنجائش نہیں ہے تو میں قوم کو کیا فائدہ پہونچا سکتی ہوں؟ جب مجھ میں دولتمندوں کی سی وسعت نہیں ہے۔ تو کیا میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنی حالت پر قناعت کروں۔

تم ایسی بہت سی عورتوں کو دیکھو گی۔ جن کا لباس نہایت خوبصورت اور قیمتی ہے، جن کا مکان بڑا عالیشان ہے۔ جن کے اسباب وسامان دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے لیکن اس تمام شان وشوکت کے باوجود وہ حد درجے کی خسیس اور بخیل، انتہا درجہ کی سنگدل اور بے مروت ہیں۔ ان کی دولت سے کسی بیکس کو کچھ نفع نہیں۔ انھیں کے بالمقابل ایسی عورتیں بھی تمکو ملیں گی۔ جن کے پاس نہ بڑی دولت ہے، نہ بڑی شوکت ہاں مگر ان میں خوبیاں ہیں۔ وہ محتاجوں کی محسنہ اور بیکسوں کی امداد کرنیوالی ہیں۔ اب ان میں سے تمھاری نظروں میں انسانیت کیلئے مفید اور دعاؤں کی مستحق کون ہے؟ مجھے سخت تعجب ہے کہ ہم غیر مفید کاموں میں کیوں کسی کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔

اور نفع بخش کاموں کو کیوں نظر انداز کر دیتی ہیں؟

مقابلہ کرنے کا جذبہ عورتوں میں فضول خرچی کی عادت پیدا کرتا ہے۔ اور فضول خرچی شوہر کی مالی حالت کو تباہ کر دیتی ہے۔ بلکہ اس کی گردن پر قرض کا بار گراں بھی لاد دیتی ہے آمدنی سے زیادہ خرچ پر مجبور کرنے والی عورت اگر اسراف کے انجام سے بیخبر ہو کر دولت لٹا رہی ہے تو وہ جاہل اور جذباتی عورت ہے۔ وہ کسی طرح انتظام خانہ داری کے لائق نہیں اور اگر جان بوجھ کر خود مختاری کے ساتھ شوہر کی دولت اس خوف سے پانی کی طرح بہا رہی ہے۔ کہ کہیں میاں دوسری شادی کے انتظامات نہ کریں تو وہ تنگی عورت ہے۔ قبل از مرگ واویلا کرتی ہے وہ بلا سے ڈرتی ہے۔ لیکن اس کا وجود خود ایک مستقل بلا ہے۔

شوہر کی دولت کو فضول خرچی سے برباد کرنیوالی اکثر وہ عورت ہوتی ہے۔ جس کا حصّہ شوہر میں سوت کی وجہ سے آدھا ہوتا ہے۔ وہ بیحساب اس لئے خرچ کرتی ہے کہ سوت کے لئے شوہر کی جیب خالی رہے۔ اور اس لئے بھی کہ شوہر سے اس کا انتقام لے کہ اس نے کیوں دوسری شادی کی۔ وہ سمجھتی ہے کہ خرچ سے عاجز کر کے شوہر کو نادم کرے گی۔ اور اس کے بعد وہ مجبور ہوگا۔ کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ لیکن وہ نہیں جانتی۔ کہ فہرست سے کس کا نام خارج ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ تخفیف کی زد میں خود آجائے۔

شوہر کے مال میں تصرف کرنے کے سلسلہ میں میں عورتوں کی ایک بری عادت کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ شوہر سے چھپا کر کچھ پس انداز کرتی رہتی ہیں۔ اکثر عورتیں اس کو تعریف کی چیز خیال کرتی ہیں۔ اور اس خفیہ جمع کردہ رقم سے اپنے پسندیدہ زیورات اور کپڑے خریدتی ہیں۔ اور بتاتی یہ ہیں کہ یہ زیورات اور کپڑے ان کے رشتہ داروں نے لا دئے ہیں۔ بسا اوقات تو خفیہ کی یہ رقم تعویذ، گنڈوں اور دیگر خرافات پر بھی خرچ ہوتی ہے۔ اس بری عادت میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو دروغ بیانی اور دوسری چوری۔ میں اس کو چوری ہی کہوں گی۔ کیونکہ اس میں اور چوروں کی چوری میں

کچھ فرق نہیں۔ بلکہ چوروں والی چوری اس سے زیادہ خفیف ہے۔ اسلیئے کہ اوّل تو چور اجنبی ہوتے ہیں۔ پھر وہ کبھی مالک کی گرفت میں آکر سزایاب بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر گرفتار نہ ہوئے تو کم از کم مالک کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی چیز چوری گئی اور یہاں تو چور وہ ہے جو مالک کے ساتھ سب سے زیادہ قرب رکھتا ہے۔ اور اس طرح چوری کرتا ہے کہ مالک کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ عورت جب ایک مقررہ مقدار جمع کر لیتی ہے تو اس کو اپنی مہارت تصور کرنے لگتی ہے۔ کاش وہ اپنے شوہر کو اس کی اطلاع کر دیتی۔ اور وہ اپنی خوشی سے اس کو بخشدیتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ دولت ہر شخص کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔ تو اب ہر شخص کو اپنی حد مقرر کر لینی چاہیئے۔ ورنہ ہماری حالت اس مینڈکی جیسی ہو جائیگی جو بیل کیطرح بڑی ہونے کی تمنا میں اس قدر پانی پی گئی۔ کہ اس کا شکم ہی پھٹ گیا۔ اور وہ مرگئی۔ عورت کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ وہ شوہر کی دولت اور اس کے گھر کی محافظ ہے۔ محافظ کو پاکباز اور امین ہونا چاہیئے۔ دوسروں کی تقلید اور مقابلہ اپنے حوصلوں میں پستی اور بزدلی پیدا کرتا ہے ہم میں موجدوں اور اختراع کرنیوالوں کا دن بدن کال ہو رہا ہے۔ اور اس کی یہی وجہ ہے کہ ہم خود دوسروں کی نقالی پر مر رہی ہیں۔ پھر اولاد کے سامنے ہم سے اچھا نمونہ اور کون ہوگا؟

مردوں کے چند عیوب

حرص و طمع

(۱)

نسائیات کے عنوان سے اب تک میں جو کچھ لکھتی رہی اور جو لکھ رہی ہوں اس کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ ازدواجی زندگی کی مشکلات اور مصیبتوں میں امکانی کمی ہو۔ اپنے گذشتہ مقالات میں میں نے عورت سے متعلق ضروری باتیں پیش کی ہیں۔ اور اب چاہتی ہوں کہ مرد کے متعلق بھی اپنے معروضات پیش کروں۔ اس لئے کہ ازدواجی زندگانی کا ایک رکن وہ بھی ہے مرد بھی اپنی مقررہ حد سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح عورت سے میری مراد ہر عورت نہ تھی۔ اسی طرح مرد سے بھی میری مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق خراب ہیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور انھیں کی وجہ سے عورتیں بدنصیب ہیں۔ اور ازدواجی زندگی کی عمارت منہدم۔

زمانے کا رنگ بدل چکا ہے، نوجوان عورتوں کی شادی کیلئے اب ان کا صرف مالدار ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی خوبیاں رخصت ہو چکیں اور ان کی جگہ ایسے خیالات اور عادات نے لے لی ہے جن کی تائید نہ نصرانی شریعت سے ہوتی ہے نہ یہودی مذہب سے ایک عام گمراہی ہے۔ جس کو لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

مرد کی حرص و طمع نے ترقی کی۔ ایسی ترقی کہ اس کے حواس پر غالب آگئی۔ اب وہ سوتا بھی ہے تو دولت کا خواب دیکھتا ہے۔ حصول مال کیلئے کوشش کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن یہ یقیناً معیوب ہے کہ مرد اپنے جذبات حرص میں اتنا خمیرا ٹھنے دے۔ کہ

ذوق ہی ترش ہو جائے۔ اور وہ جس چیز کو دیکھے حرص کی عینک سے حتیٰ کہ اپنی دلہن کو بھی۔ سب سے پہلا سوال شادی کرنیوالا یہی کرتا ہے کہ اس کی مالی حالت کیا ہے۔ اور دولت اس کے پاس کتنی ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ دلہن کا باپ سونا اور ماں چاندی ہو، اس کے اخلاق پیتل ہوں۔ وہ خود چاہے مٹی ہو۔ لیکن اسکی ہتھیلیاں بڑی بڑی جاگیریں اور زمینیں ہوں بہر حال اگر مال ہے تو شادی ہو جاتی ہے۔ ورنہ عورت یونہی بیٹھی بیٹھی معمر ہو جاتی ہے اور اپنے ساتھ اپنا پاکیزہ قلب، حسن معاشرت اور تربیت اولاد کی صلاحیت غرض اپنی تمام خوبیاں قبر میں لے جاتی ہے۔

دولتمند بیوی سے خوشی اور محبت کا اظہار بھی شوہر تھوڑے سے ہی دنوں تک کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کی نیت بدل جاتی ہے۔ وہ بیوی کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی دولت کا اس کو شرعی اور قانونی وکیل بنا دے۔ تاکہ اس کو نوابی شان دکھانے کا موقع ملے۔ اور وہ رئیسوں کیطرح اکڑتا پھرے۔ اور نفسانی خواہشوں اور کھیل تماشوں میں من مانی دولت لٹائے۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ جب مرد کی دولت عورت صرف کر سکتی ہے تو کیوں نہ مرد عورت کی دولت خرچ کرے؟ مگر اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مرد، عورت کے تمام مصارف کا خدا کی طرف سے ذمہ دار ہے۔ اور عورت پر مرد کے مصارف کا کوئی ذمہ نہیں۔ ہاں البتہ اگر مرد بالکل محتاج ہے اور عورت کے پاس دولت ہے تو یہ اس کی مروت اور محبت کے خلاف ہوگا۔ کہ شوہر دوسروں سے قرض مانگتا پھرے، اور وہ خود اپنی دولت میں سے اس کو کچھ نہ دے۔ حالانکہ وہ اس کا شریک زندگی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی عورت جو کچھ دیگی وہ اس کا احسان اور کرم ہوگا۔ جس پر اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ چاہے دے نہ چاہے تو نہ دے۔

اسی طرح وہ مالدار عورت جس کا شوہر شادی کے وقت اچھی حالت میں تھا۔ لیکن بعد میں زمانے کی گردش نے مفلس کر دیا۔ ایسی حالت میں عورت کا اجتماعی فرض ہی

کہ وہ اپنے شوہر سے بخیلی نہ کرے، اور نہ اس سے جدا ہو جانیکا خیال دل میں لائے۔ اس لئے کہ دونوں رنج و راحت کے شریک ہیں۔ اور فرض کرو وہ مالدار نہ ہوتی، پھر تو اس کو بھی آبرو محفوظ رکھ کر مرد کی محنتوں میں ہاتھ بٹانا پڑتا۔ الغرض ایسے مواقع پر شوہر کی مالی امداد عورت کا فرض ہے۔ لیکن اس اطمینان کے بعد کہ شوہر اس کا پیسہ شراب، جوئے یا فسق و فجور میں صرف نہیں کرے گا۔ ورنہ اگر اس قسم کی نالائقی کا شبہ ہے تو ایک پائی بھی نہ دینی چاہیے۔

اور بعض تو ایسے شریف اور عالی ظرف ہوتے ہیں جن کا اخلاق ان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ نیکی کا بدلہ برائیوں سے دیں۔ چنانچہ وہ اپنی عورت کی کل دولت لٹا دینے کے بعد ایک دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ احسان کا یہ کتنا بُرا معاوضہ ہے۔

عورت کی دولت اس کیلئے چھوڑ دینی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی خوبیوں اور زینتوں میں صرف کرتی رہے۔ یوں تو عورت کی دولت بہرحال مرد کے مصارف میں تخفیف کا باعث ہوتی ہی رہے گی۔ اور اگر دونوں میں اتحاد رہا اور خدا نے ہنسی خوشی زندگی گذار دی تو یہی دولت اولاد کے کام آئیگی۔ پھر کیوں مرد عورت کی دولت ختم کر دینے کیلئے بیچین ہے۔ آج ہی کل دولت لٹا کر کل دوسروں کا محتاج ہو جانا اچھا ہے۔ یا اس کو محفوظ رکھنا تاکہ آئندہ بلا محنت ایک خزانہ ہاتھ آجائے۔ اور پھر مرد نے اگر وفاداری کا ثبوت دیا اور عورت کو اس کی نیک نیتی کا یقین آگیا تو وہ اس پر اپنی جان تک قربان کر دیگی۔ چہ جائیکہ دولت جو ایک فانی اور انقلابی چیز ہے۔

میں اس مرد کو خوددار اور بامروت نہیں کہوں گی جو تنگدستی ہی کی وجہ سے کیوں نہ سہی اپنی بیوی کے زیور فروخت کر دیتا ہے۔ مرد کے یہ معنی نہیں کہ وہ کاہل بنا بیٹھا رہے کیوں حصول رزق کیلئے وہ دوڑ دھوپ نہیں کرتا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنی بیوی کی دولت کا وکیل ہے؟ عورت کے مال سے فائدہ اٹھانیوالوں میں میں اسی مرد کو حق بجانب

سمجھوں گی جو اپنی انتہائی کمزوری یا معذوری کی وجہ سے کسی کام پر لگنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

عورت کی دولتمندی کا ایک پیچیدہ پہلو یہ بھی ہے کہ بعض مرد اپنی بیوی کو طلاق کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ جس سے اس غریب کے سامنے گو نہ مشکل وگر نہ گو نہ مشکل والی مصیبت پیش ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے اسی میں آسانی ہے۔ کہ شوہر کو اپنا مال دیکر طلاق کی مصیبت سے بچے۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ طلاق کی دھمکی ہر وقت دی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے بد اخلاق حریص اور طماع شوہر سے تو طلاق لے لینا ہی بہتر ہوتا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلدہی اور ملاطفت کی تعلیم دی ہے۔ اس لئے اس کے حق میں یہی بہتر ہے۔ جس عورت کو اپنے شوہر کی امانت میں شک ہے۔ اس کو چاہیئے کہ وہ اپنی دولت کا قانونی وکیل تو شوہر کو کردے لیکن شرعی وکیل نہ بنائے۔ اس طرح وہ اصل سرمایہ کی حفاظت بھی کر سکے گی اور شوہر کے ساتھ رعایت بھی ہو جائے گی۔

عورت بہرحال مظلوم ہے اگر غریب ہے تو کوئی شادی نہیں کرتا۔ اور اگر مالدار ہے تو اس کی دولت پر دانت تیز ہیں۔ اب یا تو وہ شادی ہی نہ کرے تاکہ حریصوں کے پنجے سے آزاد رہے۔ یا پھر شادی کر کے شوہر کے جبر و ظلم میں گرفتار ہو۔ کاش ہمارے یہاں منگنی اور شادی کا ایسا نظام ہوتا جس سے مردوں کے اخلاق کی صحیح تمیز شادی سے پہلے ہو جایا کرتی۔

ظلم اور زبردستی

(۲)

بعض خبروں کا اثر دل پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور عرصہ تک باقی رہتا ہے۔ اسی

قسم کی موثر اور دل میں باقی رہنے والی اطلاع ایک مرتبہ مجھے ملی، اور وہ اس طرح۔

ایک دن میں اپنی ایک ملنے والی کے گھر گئی۔ باتوں باتوں میں میں نے ایک خاتون کی حالت دریافت کی جس سے میری پرانی دوستی تھی۔ اور عرصہ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مغموم آواز میں کہا۔ اس کا تو برا حال ہے۔ فرطِ غم نے اسکو بیمار کر دیا۔ اور ہوا یہ کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ اور دوسری بیوی عنقریب آنے والی ہے۔ مجھے متحیر دیکھ کر کہنے لگی، آپ کو تعجب کیوں ہے۔ کیا اس قسم کے واقعات بکثرت نہیں ہوتے رہتے؟ میں نے جواب دیا مجھے اس واقعے پر تعجب نہیں ہے حیرت اس بات پہ ہے کہ اس کا تعلق اُس خاتون سے ہے۔ اُس کو تو آپ بھی جانتی ہیں۔ وہ کیسی خوبصورت با اخلاق اور تعلیمیافتہ خاتون ہے، میں سنا کرتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اطمینان اور خوشی کی زندگی بسر کر رہی ہے اور خود میں نے اس کو اس کے گھر میں دیکھا۔ اپنے تمام کام بڑی خوبی اور صفائی سے کرتی تھی۔ اسباب سب قرینے سے رکھے ہوئے پورا گھر آراستہ ننھے ننھے بچے موجود۔ اب اس سے زیادہ اس کا شوہر کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا۔ کہ اس کے دونوں بچے ایک ہی ماہ میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس لئے شوہر نے اُسی ماہ دوسری شادی کر لی۔ حالانکہ پہلی بیوی تیسرے بچے کی ماں ہونیوالی تھی۔ اُف مرد کس قدر سنگدل ہے! اس غریب کا سارا جرم یہ ہے کہ اس کے دونوں بچے مر گئے۔ کیا بیوی پر اس کے دونوں بچوں کی جدائی کا ستم کافی نہ تھا۔ جو ایک اور زہر آلود تیر سے اس کے دل کو شوہر نے زخمی کر دیا۔ کیا عزرائیل کی ڈاک سے شوہر نے اپنی بیوی کے وہ خطوط ضبط کر لئے تھے۔ جن میں اُس نے اپنے جگر پاروں کو اُچک لیجانے پر اس کو ابھارا تھا؟ اور کیا یہ دونوں بچے غریب عورت ہی کے تھے اس کے نہ تھے؟ یہ صحیح ہے کہ مرد عورت سے زیادہ قوی ہے۔ اور مصائب کی برداشت میں وہ عورت سے زیادہ توانا اور مضبوط ہے۔ لیکن کیا توانائی شفقت کے جذبات سے نا آشنا ہوتی ہے۔ کیا قوت کی آنکھیں رحم کے مواقع نہیں

دیکھتیں ؟ یقیناً یہ شوہر کی ناقابل تسلیم زیادتی ہے۔

عورت اگر کسی کی تسلیوں اور عنایتوں کی محتاج ہے تو وہ اپنے غم اور ملال کے دنوں ہیں، اب دو بچّوں کے مرجانے سے زیادہ ملال کا دن اور کون ہوگا۔ کیا اس مصیبت کے دن میں جبکہ مرا پنا، بیگانہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، شوہر کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ بیوی کے ملال میں ناقابل برداشت اضافہ کردے ؟ اگر بیوی کا بھائی یا کوئی اور رشتہ دار مرجاتا تو بھی شوہر کا فرض تھا کہ وہ خواہ اوپر ہی کے دل سے سہی اپنے کو اس کا شریک غم بناتا۔ زبانی ہی سہی مگر اپنی ہمدردیوں کا اظہار کرتا۔ لیکن یہاں تو خود اسکی اولاد ہے۔ یہاں اس کے سوا کس کو حق پہونچتا ہے کہ عورت کے آلام اور مصائب میں تخفیف کا باعث بنے۔ اور اگر وہ اس کی مصیبتیں کم کرنا نہیں چاہتا تو زیادہ بھی نکرے لیکن وہ تو دوسری شادی کرکے عورت کے دل کو دو ٹکڑے کر رہا ہے، اور پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کی نئی بیوی بے اولاد نہ ہوگی۔ یا اولاد والی ہوگی تو پہلی بیوی کی اولاد کی طرح مر نہیں جائیگی۔ قدرت سے جنگ نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کے فیصلے بدلے جاسکتے ہیں۔ اولاد، موت اور زندگی یہ سب قبضۂ قدرت کی باتیں ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ خدا کب دیگا اور کب چھین لیگا۔

اس مظلوم عورت کے شکم میں دو چیزیں بیک وقت نہیں رہ سکتیں۔ بہت ممکن ہے کہ غم اُس بچّے کو مردہ کرکے باہر پھینک دے، یہ ظالم شوہر یقیناً قانون کی نظر میں، مروّت کی نظر میں، انسانیت اور محبّت کی نظر میں مجرم ہے۔

اس الم انگیز حادثے نے مجھے اسی قسم کے ایک اور واقعے کی یاد دلادی۔ ایک عالی مرتبہ بزرگ نے ناراض ہوکر بیگم کو طلاق دیدی۔ جرم یہ کہ اس سے ہر مرتبہ لڑکی ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس امید پر دوسری شادی کرلی۔ کہ لڑکا پیدا ہوگا۔ لیکن پہلی مرتبہ لڑکی ہی پیدا ہوئی۔ اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ بھی لڑکی ہی پیدا ہوئی۔

آخر تک خدا کی مرضی ان کے خلاف ہی فیصلہ کرتی رہی۔ اب ان کے حضرت کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ان کو تبادلے میں لڑکیاں ہی ملیں۔ اور ایک محبوب بیوی کا خسارہ بھی اٹھانا پڑا۔ پھر پہلی بیوی کی نوجوان لڑکیوں کی طبیعت آپ کی طرف سے جو پھر گئی، وہ مزید خسارہ۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اگر لڑکیوں کی پیدائش تھوڑی دیر کیلئے معیوب مان بھی لیجائے، تو اس میں عورت کا کہاں تک قصور ہے؟ کیوں نہ مرد کو اسی طرح ذمہ دار سمجھا جائے۔ جس طرح عورت کو اور کیوں نہ عورت مرد سے ناراض ہوکر مطالبہ کرے کہ میں آپ سے جدا ہوکر دوسرے سے نکاح کرنا چاہتی ہوں تاکہ لڑکے پیدا ہوں، اگر مرد عورت پر بلا وجہ الزام عاید کرتا ہے تو عورت بھی مرد کو اسی طرح ملزم بتاسکتی ہے۔ اپنے اپنے دعوے میں دونوں برابر ہیں۔

ہمارے لئے گھر کے اور بہت سے کام ہیں۔ اور ہم کو اپنی بہت سی پرانی اور معیوب عادتوں کی اصلاح کرنی ہے۔ اس لئے مردوں کو چاہئے کہ اپنے قابل شکایت افعال سے ہماری راہ میں روڑے نہ اٹکائیں اور ہم کو اپنا کام کرنے دیں۔

میرا خیال ہے کہ ایک طرف مردوں پر حکومت ظلم کرتی ہے، دوسری طرف زندگی کی تنگیاں ان کو ستاتی ہیں۔ اور ان دونوں کا انتقام لینے کیلئے ان کو ہمارے علاوہ کوئی ملتا نہیں۔ اس لئے کہ ہم سے زیادہ کمزور اسلحہ رکھنے والا مقابل اور کون ہوگا؟

اے خدا ہماری حکومت کے افسروں میں انصاف اور رحم کے جذبات پیدا کر اس لئے۔ کہ ان کے ظلم کا اثر دو چند ہوکر ہم تک پہونچتا ہے۔

عورتوں کی تحقیر

(۱۲)

عورتوں کو منحوس سمجھنے کا تخیل شاید عہد جاہلیت کے عربوں سے ہم لوگوں میں منتقل ہوگیا۔ اور اب تک وراثتہً چلا آرہا ہے۔ عرب میں عہد جاہلیت کے لوگ اپنی لڑکیوں کو مفلسی کے خوف سے یا عار سمجھکر زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرمناک عادت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ لیکن اس کا اثر اب تک ہم میں باقی ہے۔ اس لئے کہ ہم لڑکے کی ولادت پر خوشی اور لڑکی کی پیدائش پر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ اگلے لوگ تو اپنی اس نامعقول حرکت کی یہ وجہ بیان کرسکتے ہیں کہ ان کا زمانہ جنگ و جدل اور لوٹ و غارت کا زمانہ تھا۔ ان کاموں کے لئے ان کو مردوں کی ضرورت زیادہ تھی۔ اور ہم تو کوئی وجہ بھی پیش نہیں کرسکتے خاندان کے نام کی حفاظت کے علاوہ میری نظر میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ ہماری فوج کی تعداد مقررہ ہے۔ اور ہم ایک امن پسند قوم ہیں۔ حتی الامکان جنگ سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک تعجب کی بات ہے کہ ہم عربوں کے مقلد کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کے جیسے کام نہیں کرتے۔ عرب اپنے لڑکوں کو بڑی مسرت اور فخر کے ساتھ فوج میں داخل کرتے ہیں۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی لڑکا فوج میں داخل ہوگیا تو فرط غم سے ہماری جان پر آبنتی ہے، میں ایسی بہت سی ماؤں کو جانتی ہوں جو اپنے فوجی بچوں کے غم میں روتے روتے اندھی ہوگئیں۔

وہ زمانہ کثرت اور شجاعت کا تھا۔ اور یہ زمانہ سیاست اور صنعت و حرفت کا ہے۔ ہمارے سامنے انگریزوں کی حکومت ہے، جن کے یہاں مردوں سے

زیادہ عورتوں کی تعداد ہے۔ لیکن وہ بہت سی ایسی قوموں پر حکمرانی کر رہے ہیں جن میں مردوں کی تعداد عورتوں سے دو چند ہے۔ خود ہمارے ملک میں اللہ کے فضل سے مردوں کی تعداد عورتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن مرد مجھے بتائیں کہ انھوں نے ملک سے کونسی بلا دفع کر دی۔ اور ملت کے لیئے فلاح و بہبود کی کونسی غیر معمولی خدمت کی۔ حالانکہ ایک وزیر کی ماہرانہ سیاست لاکھوں فوجیوں سے زیادہ مفید خدمت انجام دے سکتی تھی۔

ان باتوں پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے جو لڑکیوں پر عنایت اور توجہ کے سرے سے قائل نہیں حقیقت یہ ہے کہ مصری عورت اپنی زندگی کی ہر منزل میں مظلوم اور قابل رحم ہے۔ ابھی وہ ماں کے شکم ہی میں ہوتی ہے کہ اس کی نحوست کا خیال مردوں کے دماغ میں آجاتا ہے۔ اور جب وہ دنیا میں آتی ہے تو استقبال کرنیوالوں کے دانت ہونٹوں سے نیا.. ان کی پیشانیوں پر بل اور ان کے سینوں میں بغض و کراہت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دایہ بھی افسردہ اور مرجھائی ہوئی رہتی ہے۔ گویا اس میں اس کا بھی کچھ جرم ہے۔ عورت کے رشتہ دار اگر لڑکا پیدا ہو تو کافی تحفے بھیجتے ہیں۔ اور اگر لڑکی ہو تو بہت کم۔ لڑکی کی ولادت کی اطلاع بھی بڑی یاس بھرے لہجے میں سنائی جاتی ہے۔ لڑکے کی ولادت کے ساتویں دن عید منائی جاتی ہے۔ دن میں چراغ روشن کرتے ہیں۔ گانے بجانے تک بھی نوبت پہونچتی ہے۔ لیکن اگر لڑکی پیدا ہوتی ہے تو بس مختصر سی رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں۔

تعلیم و تربیت میں بھی لڑکی کا بہت کم حصہ ہے۔ جہاں وہ کچھ بڑی ہوئی کہ مدرسہ سے خارج۔ اس سلسلہ میں مجھے جاہل ماؤں سے زیادہ ان روشن خیال مردوں کی ذہنیت پر تعجب ہے۔ جو لڑکیوں کے لیئے صرف اسی قدر تعلیم کی اجازت دیتے

ہیں کہ وہ معمولی نوشت و خواند کر لے اور کھانا پکانا سیکھ لے۔ گویا علم صرف مردوں کے لئے پیدا کیا گیا۔ حالانکہ خدا نے علم کو کسی جماعت سے مخصوص نہیں کیا۔ مردوں کی یہ ذہنیت صاف طور پہ بتاتی ہے کہ وہ ہمکو اپنے گھروں کے لئے صرف خادمہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ عورتیں تعلیمیافتہ اور مہذب خواتین کا درجہ حاصل کریں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا فطری حق دبا کر کس طرح مرد "دستور" کا مطالبہ کرتے ہیں۔ (اس وقت تک مصر میں موجودہ طرز کی دستوری حکومت نہ تھی اور مصری اسی کا مطالبہ کرتے تھے۔)

عہد شباب میں پہونچکر بھی عورتوں کی حالت بچپن سے کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں رہتی۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہم میں اور قیدیوں میں فقط نام کا فرق رہ جاتا ہے مرد کو تو ہر بات کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہم ہر بات سے حتیٰ کہ تازہ ہوا سے بھی محروم رہتی ہیں۔ ہمکو اپنے کپڑوں کا رنگ پسند کرنے کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی ہمکو کہیں جانے کی اجازت ملی بھی تو راستہ چلنے والوں کی دناءت اور بیہودگی نے ہمکو وہاں بھی شرمندہ کیا۔ حالانکہ اپنی ذلیل حرکتوں پر شرم اُن کو آنی چاہیئے۔

شادی ہو جانیکے بعد تو ہماری مجبوریوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ شوہر کا استبداد عورت کو اس طرح مقہور و مجبور کرتا ہے کہ وہ زندگی اور احساس بلکہ خود کو بھی بھلا دیتی ہے۔ اس مرد سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اپنی بیوی کو اس کے ماں باپ کے یہاں جانے سے بلا وجہ روک دے۔ اس شوہر سے بڑھکر جابر کون ہوگا جو پڑوسی عورتوں کو یا بیوی کی ملنے والیوں کو گھر میں اس لئے نہ آنے دے کہ کہیں اس کے مظالم کے خلاف بیوی میں مقابلے کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں۔ ایسا شوہر عورت کی صحت، عورت کی دولت، عورت کے وقت غرض عورت کے تمام معاملات پر جابرانہ تسلط رکھتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ دریافت کرنا چاہے تو یہ کہکر خاموش

کر دیتا ہے کہ تم کیا سمجھ سکتی ہو؟ اور جو کہیں اس کے اخراجات کے متعلق بیوی نے سوال کر دیا تو فرمانے لگے۔ ان معاملات میں تمکو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔
اس سے زیادہ مرد کی طرف سے عورت کی تحقیر کیا ہو سکتی ہے۔ کہ وہ دسترخوان پر تنہا بیٹھ جائے اور اپنی بیوی کو اپنے ساتھ کھانے کیلئے نہ بلائے۔ اور جب وہ کھا چکے تو بیوی نوکروں کی طرح کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے کھائے۔ اس سے بڑھکر عورت کی ذلت کیا ہوگی۔ کہ شب میں جب تک شوہر نہ آئے اس کو جاگتے رہنا چاہئے۔ اور اگر وہ خدانخواستہ بیمار ہو جائے تو نہ میاں اسکو ایک گھونٹ پانی پلائیں اور نہ دو منٹ کے لئے اس کے پاس ٹھہریں۔ حالانکہ مریض اس سے زیادہ مصیبت اپنے لئے کوئی نہیں سمجھتا۔ کہ اس سے بے رخی کی جائے۔
مرد کے اعمال و افعال میں عورت کی تحقیر صاف صاف نظر آتی ہے۔ بیوی اگر کسی روز غمگین ہے تو شوہر کبھی نہیں پوچھے گا۔ کہ بات کیا ہے؟ خود اگر کوئی نیا کام شروع کرتا ہے تو اس کی اطلاع تک اس کو نہیں کرتا۔ وہ گھر سے نکلتا ہے۔ تو ضروری کام کیلئے ہی واپس آتا ہے۔ اس کے دلی خیالات اور میل جول کی باتیں دوستوں کا حصہ ہیں۔ بیوی کو تو وہ ایک پکانیوالی یا گھر کی نوکرانی سمجھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہوٹلوں میں کھانے سے خرچ میں زیادتی کا خوف نہ ہوتا تو شاید شوہر کھانے کیلئے بھی گھر میں نہ آتا۔
اس سے بڑھکر عورت کی حقارت کیا ہو سکتی ہے کہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں شوہر کے منھ سے ایک لفظ نکلتا ہے اور اتحاد کا تار تار ٹوٹ جاتا ہے، ایسے تاریک مستقبل سے عورت کیا امیدیں وابستہ کر سکتی ہے، مذہب نے تعدد ازدواج اور طلاق کی اجازت دی ہے۔ مگر اس طرح بلا شرط نہیں جیسا کہ مرد کر رہے ہیں اس کے لئے خاص خاص شرائط اور پابندیاں ہیں اور اگر ان کی اتباع کی جاتی تو عورتوں پر آج کوئی مصیبت نہ آتی۔

ہمارے یہاں کے اکثر مردوں نے یورپ کی سیر کی ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ کہ کس طرح وہاں کے مرد عورت کا احترام کرتے ہیں۔ وہاں کے ہر اجتماع میں عورت کا درجہ پیش پیش ہے۔ یہ لوگ یورپ سے واپس آتے ہیں اور تعلیم نسواں کے فرض و واجب ہونے پر ایک ہنگامہ مچا دیتے ہیں با پُر زور الفاظ میں اپنے کو عورت کے حامیوں میں گناتے ہیں۔ اور عورت کو ہر طرح احترام کا مستحق کہتے ہیں۔ لیکن یہ سارا شور و غل یہ ساری لفاظی ہوا میں اڑ کر رہ جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی یورپین خاتون سیاحت کے لئے آگئی تو پھر انھیں خیالات کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ اس کے پاس جاتے ہیں بڑے اخلاق کے ساتھ اس سے ملتے ہیں۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کو سہارا دیتے ہیں۔ اس کا ہینڈ بکس اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور اظہار احترام کے طور پر ٹوپیاں سروں سے اتار کر ہاتھوں سے اونچی کرتے ہیں۔ اپنی جگہ پر یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن یہی بزرگ اپنی بیوی کے ساتھ ایک گاڑی میں سوار ہونے سے رُکتے ہیں۔ سفر کا موقع ہے یا کسی دوسرے مکان میں منتقل ہونا ہے تو آپ بیوی کے ساتھ نہیں جاتے۔ گویا آپ وہ روشن خیال تعلیم یافتہ نہیں ہیں جو ابھی کل ہی مجلس میں عورتوں کے احترام اور ان کی حمایت میں تقریر فرما رہے تھے۔ کسی جلوس یا جلسہ کے موقع پر میں نے خود دیکھا ہے کہ مرد عورتوں سے مصادم ہو کر چلتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حشر کا میدان ہے، یہ ہے ہمارے یہاں عورتوں کا احترام؟

میں یہ مانتی ہوں کہ ہم میں بھی عیوب ہیں۔ جن کی اصلاح ہونی ضروری ہے اور ہم میں بعض ایسی عورتیں ہیں جو بہت زیادہ احترام کی مستحق نہیں۔ لیکن سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا کہاں کا انصاف ہے۔ مجرم کی صف میں غیر مجرم کو بھی کیوں کھڑا کر دیا جاتا ہے میرا خیال ہے کہ مرد اگر اپنی نخوت اور سرکشی میں تھوڑی سی کمی کر دے۔ اور یہ سمجھے۔ کہ اس کی بیوی تمام مشترکہ حقوق میں اس کی برابری کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس لئے اس کو آقا

اور غلام کا سا برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے۔ تو عورت سے متعلق اس کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔

کسی مرد کے شکم میں اللہ نے دو دل نہیں بنائے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ایک طرف تو وہ انتہا درجے کا جابر اور ظالم بنا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف آزادی اور دستور کا مطالبہ کرتا ہے۔ سنیئے اگر مرد ہم پر عنایت اور احترام کی نظر ڈالتے تو ہم انھیں کے حسب منشا ہوتے۔ ہم تو آئینہ کی طرح ہیں۔ ہم میں انھیں کا رنگ و روپ اور انھیں کی صورتیں نظر آئیں گی۔ ہمارے دلوں میں اسی طرح احساس ہے جس طرح ان کے دلوں میں اب اگر وہ ہماری اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی کرلیں۔

تعلیمیافتہ مردوں کے گھر

جب کبھی مجھے پڑھے لکھے افراد کے گھروں میں جانیکا اتفاق ہوا اور میں نے دیکھا کہ ان کے یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں جاہل مطلق ہیں۔ تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب میں سنتی ہوں کہ فلاں غیر تمند کی لڑکیاں بڑی شوخ ہیں۔ فلاں اہل علم کے گھر کی عورتیں عاملوں کو بلا کر حاضرات ارواح کا عمل کراتی ہیں۔ فلاں تعلیمیافتہ کے بچے تعویذات اور گنڈوں سے لدے ہیں۔ فلاں صحیفہ نگار کی بیوی جس کو تعلیمیافتہ ہونیکا دعویٰ ہے اس سوال پر کہ اس کے شوہر کی پالیسی اور سیاسی نظریات کیا ہیں۔ یہ جواب دیتی ہے کہ وہ اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتی اور نہ اس کو اس کے شوہر کے سیاسی خیالات کا علم ہے۔ تو مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ اور میں دلی رنج و قلق محسوس کرتی ہوں۔ مجھے ان خواتین اور لڑکیوں کی حالت پر جس قدر افسوس ہوتا ہے اتنا عام خواتین کی حالت پر نہیں۔

ایک کسان اپنی لڑکی کو مدرسہ نہ بھیجنے پر یہ عذر کر سکتا ہے کہ وہ خود علم سے ناواقف ہے اور پھر کاشتکاری کے کاموں میں اس کو اپنی بیوی بچوں کی بھی ضرورت ہے۔ ایک مزدور یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کو اس لئے مدرسہ میں داخل نہیں کیا کہ دن بھر کی محنت سے جو مزدوری اس کو ملتی ہے وہ گھر والوں کی شکم پُری کیلئے کافی نہیں ہوتی تو تعلیم پر کہاں سے خرچ کرے۔ اسی طرح معمولی تعلیم کے لوگ بھی عذر کر سکتے ہیں کہ پیٹ کی فکر نے ان کو اعلیٰ تعلیم سے باز رکھا۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ اور روشن خیال حضرات اپنی اس غلطی پر کیا عذر پیش کریں گے۔ کہ انھوں نے اپنی لڑکیوں کی تربیت ماحول کے حوالے کردی ہے۔ مائیں وہم اور خرافات کی فضا میں جس طرح چاہتی ہیں ان کی پرورش کرتی ہیں۔ ان روشن خیال حضرات سے اگر آپ گفتگو کریں گے تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ خود تو بڑی وسیع معلومات رکھنے والے اہل علم اور فاضل ہیں۔ فلسفی ہیں، مخصوص نظریات اور اصول رکھتے ہیں، ان کا دل قوم کی حالت پر مارے غیرت کے کھول رہا ہے۔ لیکن گھر والوں کی حالت یہ ہے، ایسے ہی لوگوں پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ بڑھئی کا دروازہ ٹوٹا ہی رہتا ہے۔

جب میں کسی شیخ الاسلام، یا مولوی یا مولانا کی لڑکی کو دیکھتی ہوں کہ وہ نماز نہیں پڑھتی یا کسی حکیم اور ڈاکٹر کی بیوی سے اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک نقشی موثر دواؤں اور تعویذوں میں کچھ فرق نہیں اور بیماری کے دور کرنے میں دونوں کا اثر ایک ہے۔ تو میں دو ہی نتیجے پر پہونچی۔ ایک تو یہ کہ وہ مولوی علوم اسلامیہ کا عالم نہیں ہے اور نہ وہ ڈاکٹر علم طب سے واقف، ان لوگوں نے اپنی حالت کو محض کسب معاش یا احترام کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ دوسرے یہ کہ علوم سے تو وہ کما حقہ واقف ہیں لیکن اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ میل نہیں رکھتے۔ اور نہ ان کو اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں مردوں میں یہی دوسری صورت زیادہ تر پائی جاتی ہے۔

پڑھے لکھے مردوں کی حالت یہ ہے کہ عصر تک کا وقت تو وہ دفتر میں یا جہاں کہیں

کام کرتے ہوں گذارتے ہیں۔ اس کے بعد سے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں چلے جا[تے]
ہیں۔ جہاں بیکار باتوں میں اپنے عزیز وقت کا خون کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد گھر[وں]
کا رخ اس وقت کرتے ہیں جب ان کی آنکھوں میں نیند آچکی ہوتی ہے پہنچتوں گذر[تے]
ہیں۔ اور ان کو سوائے چھٹی کے دن کے اپنی اولاد کی صورت تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی [اس]
طرح بچے چھوٹے سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو اپنے والد کے اخلاق وعادا[ت کا]
پتہ تک نہیں رہتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے باپ اپنے بچوں کے ساتھ میل جول ا[ور]
گفتگو میں کچھ وقت صرف کرنے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اس سے ا[ن]
کے وقار میں کمی ہوگی۔

بعضوں کی یہ حالت ہے کہ وہ گھروں میں عورتوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہتے ہیں
اور کچھ بولتے ہی نہیں۔ اور جب بیٹھے بیٹھے گھبرا جاتے ہیں تو کوئی اخبار اٹھا لیتے ہیں [م]
ستم یہ کہ زور سے نہیں پڑھتے۔ کہ بیوی بھی کچھ سنے۔ اور اپنے شوہر کی طبیعت اور خیالا[ت]
کا اندازہ لگائے۔ اب وحی تو آنے سے رہی۔ اور غیب کے حالات کا انکشاف اس پر ہو نہیں
سکتا۔ اور میاں کچھ بولتے ہی نہیں۔ اب اولاد کی تربیت شوہر کے معیار پر کون کرے
کون بچوں کو روزانہ ہونیوالے واقعات میں اخلاق کا درس دے۔ اور خلوص کے سا[تھ]
روز مرّہ کے حوادث سے پند ونصائح پیش کرے۔ تنہا مدرسہ بچوں میں وہ مطلوبہ کیفیت
پیدا کرنے کیلئے کافی نہیں۔ ماں کے پاس خانگی کاموں سے اتنا وقت بچتا نہیں۔ کہ [و]
اپنے ساتھ بٹھا کر اپنی خوبیاں اور محاسن ان کے نازک اور سادہ دلوں پر نقش کرے [اور]
یہ بھی اس وقت جب ماں شریف تعلیمیافتہ اور با اخلاق ہو۔ ورنہ جاہل اور بداخلاق
ماں سے تو اس کی بھی توقع نہیں۔

اور لڑکے پر چونکہ باپ کی نظر عنایت خاص طور پر رہتی ہے۔ اور وہ باہر کے
لڑکوں کے ساتھ مل جل کر کافی وقت گھر سے باہر بھی گذارتا ہے۔ اس لئے وہ تجرباتی

ر واقعات سے فائدہ اٹھانے لگتا ہے۔ لیکن لڑکی کو اپنی ذاتی تربیت کا بہت کم موقع
تا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ اور شفیق باپ اگر اپنی اولاد کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھے
وہ بچوں کو ایسی بہت سی باتیں بتا سکتا ہے جو ان کے تجربے میں نہیں آئیں۔
میں ایسے باپ کو ہرگز پسند نہیں کرتی۔ جو اپنی اولاد کیلئے نہایت خوفناک ہوا بنا
ہے۔ جو اپنا وقار اسی میں سمجھتا ہو کہ اس کے گھر میں آتے ہی گھر والوں پر رعب و دہشت
ا بادل چھا جائے ر وقار اور ہیبت ضروری ہے۔ لیکن اعتدال کی حد تک اور جب
خوف اور دہشت کی حد میں داخل ہو گیا۔ تو پھر شفقت اور پیار والد کے دل سے
صت ہو جاتا ہے۔ اور بچے بھی باپ سے زیادہ تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ
ہے کہ بچے باپ سے زیادہ ماں کی محبت کرتے ہیں۔
اور پھر باپ کا یہ رعب بچوں کے اخلاق کو کمزور اور خراب کر دیتا ہے۔ کیونکہ
ں میں بزدلی اور پستی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بڑے ہو کر تو ضد اور
ستبداد کا مجسمہ بن جاتے ہیں۔ بخیلوں کی اولاد بڑی فضول خرچ دیکھی گئی ہے۔
ایک دفعہ میں ایک خاتون سے ملنے گئی جس کا شوہر اسی قسم کا متکبر اور کرخت تھا
سب اکٹھا بیٹھے باتیں کر رہے تھے، چھوٹے چھوٹے بچے قریب ہی کھیل رہے تھے
جوان لڑکیاں بھی ہنس بول رہی تھیں۔ یکایک سب کی سب چپ ہو گئیں۔ لڑکیوں
ے چہرے زرد پڑ گئے، ایک دوڑی چھوٹے بچوں کے پاس گئی کہ ان کو چپ کرائے
سری والد کے کمرہ میں چلی گئی کہ کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں ہے۔ میں اس
ایک تبدیلی پر حیران تھی، تعجب سے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ خاتون نے بہت
ہستہ اور محزون آواز میں کہا کہ شاید "وہ" آگئے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ
ر یہ سارا اضطراب اور لرزہ شوہر کی آمد پر شک کی حالت میں ہے تو اگر اس کی آمد
ا یقین دلا دیا جائے تو کیا کچھ ہوگا؟ لڑکیوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے والد کے

سامنے بات نہیں کرتیں اور ہمیشہ ان کے راستے سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ بڑے غصے والے ہیں۔ وہ ان کو کبھی کسی سہیلی اور رشتہ دار سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان میں سے کسی سے اگر کسی کام میں دیر یا غلطی ہوگئی (اور خوف و دہشت کی حالت میں اکثر تاخیر اور غلطیاں ہوتی رہتی ہیں) تو بُری طرح پیش آتے ہیں۔ جب وہ کھانے پر بیٹھتے ہیں تو ہم تینوں بیٹیاں لونڈیوں کی طرح اور اماجان بھی کھڑی رہتی ہیں یہ دیکھکر کہ بعض مردوں میں استبداد کی روح اس طرح جڑ پکڑے ہوئے ہے اور وہ اپنے گھروں میں اپنے جگر گوشوں کے لئے بھی ایسے سنگدل واقع ہوئے ہیں۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔

اس قسم کا ظالم باپ اگر اپنی اولاد کو تعلیم دینا بھی چاہے تو ناکام رہے گا۔ اس لئے کہ خوف کی شدت نے پہلے ہی غور و فکر کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مجھے اپنے بھائی کی زبانی اسی مرد کے متعلق معلوم ہوا کہ گھر سے باہر وہ تمام ملنے والوں کیلئے بڑا خلیق بڑا ملنسار اور ظریف ہے۔ خدا کی شان غیروں کے لئے ہنسی مذاق کی یہ دریا دلی اور اپنے اہل و عیال کے لئے ایک تبسم سے بھی بخیلی۔

میں تمام شوہروں اور والدوں سے درخواست کروں گی کہ اپنے گھروں میں وہ جو حکومت اور اقتدار چاہتے ہیں اس کی حد یہیں تک کافی ہے کہ ان کے بچے اور ان کی عورتیں صحیح معنوں میں ان کی مقلد ہوں۔ پورا خاندان سچی محبت کے رشتہ میں منسلک ہو۔ وہ فطری محبت جو خدا نے عطا کی ہے۔ کیوں اس کو اپنی خشکی اور جفاؤں سے ضائع کرتے ہیں۔ کیوں اپنے ماحول میں اولاد کیلئے اپنی روح نہیں پھونکتے۔ تاکہ شکل و شباہت کی طرح بچے اپنے والدین سے بہترین تاثیر اور بہترین اخلاق کے بھی وارث ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم میں سے ہر شاعر۔ ہر ریاضی داں اور ہر سیاسی اپنی اولاد کو شاعر، ریاضی داں اور ماہر سیاست بنا دے۔ تاکہ مطلوبہ اتحاد حاصل

ہو جائے اور زندگی کی روح ہم میں نمایاں ہو۔

میاں بیوی میں تکلف

شہری میاں بیویوں میں کچھ اس قدر تکلف ہوتا ہے کہ اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ خدا نے تو چاہا تھا کہ عورت مرد ایک دوسرے سے سکون اور اطمینان حاصل کریں۔ اور باہمی تکلف کی وجہ سے یہی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مناظر قدرت بھی اپنے اندر سادگی اور بے تکلفی رکھتے ہیں۔ آسمان کو دیکھو ہر جگہ اسی طرح افق پر چھایا ہوا ہے۔ خدا نے ایسا نہیں کیا کہ اٹلی میں اس کے لئے مرمر کا ستون بنا دیا ہو۔ یا سوڈان میں اس کے لئے ہاتھی دانت کے پاؤں لگا دئے ہوں۔ یا آسٹریلیا میں بلور کی دیواروں سے اس کو تھام رکھا ہو۔ قطبین کے علاوہ ہر جگہ آسمان کو دن میں آفتاب روشن رکھتا ہے۔ اور شب میں چاند۔ اس پر تارے بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا اس بات پر قادر تھا۔ کہ ان تاروں سے تاج یا حسین و جمیل ہار کی صورتیں بنا دیتا۔ یا رنگ برنگی فرش کی طرح کہیں دائرے اور کہیں مثلث کی شکلیں مرتب کر دیتا۔ لیکن آسمان کی سادگی ہی میں غور کرنیوالے کیلئے دلکشی کا بہت کچھ سامان ہے۔ زمین بھی اپنے اندر سادگی اور مقررہ نظام رکھتی ہے۔ چٹانوں کو مسلسل ہوا اور بارش کی زد توڑ کر ریگ و ذرات بنا دیتی ہے۔ پھر ریگ و ذرات ہی ہوا یا پانی پی کر چٹان بن جاتے ہیں یہ تمام مناظر کس قدر سادگی اور بے تکلفی رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ چین کے ایک بادشاہ نے صناعوں اور کاریگروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کاریگری کے اعلیٰ نمونے شاہی محل کے دروازے پر آویزاں کریں۔ تاکہ بہترین کاریگر کی قدردانی کی جائے۔ اور اس کو انعام دیا جائے۔ ایک دن جبکہ بادشاہ

پیش کردہ نمونے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کو ایک خوبصورت تصویر کی لوح نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بادشاہ نے مصوّر کو حاضری کا حکم دیا۔ تاکہ اس کی مہارتِ نقاشی پر انعام دے۔ دربار کے اہلِ نظر جمع ہوئے۔ اور بادشاہ نے فیصلے کیلئے ان کے سامنے وہ تصویر پیش کی۔ سبھوں نے پسند کیا۔ اور مصوّر کو انعام کا مستحق بتایا۔ لیکن ایک باخبر نے کہا کہ تصویر میں عیب ہے۔ اس کی نقاشی میں تکلّف اور تصنّع سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اصل حقیقت دور ہو گئی ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ کس طرح؟ اس نے جواب دیا کہ مصوّر نے خوشۂ گندم پر ایک چڑیا کی تصویر بنائی ہے۔ لیکن ڈالی باوجود بہت باریک ہونے کے کھڑی ہے۔ حالانکہ چڑیا کے بیٹھ جانے پر اس کو بہت زیادہ جھک جانا چاہیے۔ بادشاہ نے معترض کی رائے پر صاد کر دی اور مصوّر ناکام ہو کر چلا آیا۔

یہ سادگی کی خوبی اور تکلّف کی خرابی کی ایک مثال ہے۔ مگر افسوس ہمارے یہاں تو میاں بیوی میں بھی بڑا تکلّف ہے۔ نام سے پکارنے میں تکلّف، بات چیت میں تکلّف کھانے پینے میں تکلّف غرض پوری زندگی تکلّف کی تکلیفوں سے بھری ہوتی ہے۔

بہت سی عورتوں کو میں جانتی ہوں اور بہنوں کے متعلق سنتی ہوں کہ شوہروں کے سامنے ان کے منھ سے بات نہیں نکلتی۔ اور اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو منھ سے کچھ کا کچھ ہی نکل جاتا ہے۔ چلنے میں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ شوہر کی آواز سنکر چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ کہیں شوہر کا تذکرہ آیا کہ ان کے جسم پر لرزہ آجاتا ہے۔ خدا کی پناہ اس خوف اور دہشت سے بھری مکروہ زندگی میں کہاں سے سعادت اور خوشگواری نصیب ہو گی، مرد میں خواہ کیسی ہی قوّت اور بہادری ہو۔ لیکن بہادری دکھانے اور انسانوں کو بھسم کر دینے کی قوّت جتانے کی جگہ عورت نہیں ہو سکتی۔ عوام کی ایک مثل ہے کہ درندہ اپنی مادہ کو نہیں کھا جاتا۔ ہم اپنے بہادر مردوں سے درخواست کرتی

ہیں۔ کہ ان کیلئے بہادری دکھانے کے اور بہت سے مواقع ہیں۔ وہاں وہ اپنی زور آزمائی کے جوہر دکھائیں۔ اور یہیں تو معذور ہی رکھیں۔

مجھے تو میاں بیوی کے معاملات میں عربوں، کسانوں اور فرنگیوں کی عادت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بیوی کا نام لیکر پکارتا ہے۔ اسی طرح بیوی اپنے شوہر کا نام لیکر بلاتی ہے۔ وہ رنج و راحت اور کھانے پینے میں عملاً شریک رہتی ہے۔ اگر شوہر نے غیظ و غضب کا اظہار کیا تو وہ بھی اپنی خودداری برقرار رکھتی ہے۔ مرد کی طرف سے نرمی اور رجحان دیکھا تو جھکنے کیلئے تیار۔ اور اگر انکار و کشیدگی محسوس کی تو خود بھی کھنچے رہنے پر آمادہ۔

اب رہی مصری خواتین کی حالت تو غالباً دنیا بھر میں ہم سے زیادہ دورنگی حال کسی طبقے کا نہیں۔ ایک طرف تو ہم اپنے زیورات اور کپڑوں کے متعلق اپنے شوہروں پر حکومت چلانے تک کی قوت رکھتی ہیں۔ اور اپنی ضد منوانے کیلئے اس کا رات دن ایک کر دیتی ہیں اور دوسری طرف ہماری خودداری اور غیرت پر اس طرح پانی پھر جاتا ہے کہ ہم شوہروں کے ہاتھوں ہر طرح کی اہانت اور تحقیر برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ مار بھی کھا لیتی ہیں۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد سب کچھ بھلا کر خود ہی معذرت بھی چاہتی ہیں۔

اگر وہ اپنے مساوی درجے کا اعلان صاف صاف کرتی رہتیں۔ تو کبھی شوہروں کے قصور پر خاموش رہ کر خود ہی معافی کی ذلت برداشت نہ کرتیں۔ لیکن شوہروں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ہمیشہ انسان کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہوتا۔ آپ اگر کسی امیر یا رئیس کا احترام کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اس کی شرافت اور انسانیت کے اعلیٰ ہونے کے بھی قائل ہو گئے۔ اور جب اس سے کسی قسم کی تکلیف پہونچے گی۔ تو اثنائے گفتگو میں اس کی پست انسانیت پر اپنے جذبات کا اظہار بھی کریں گے۔ عورت اگر اپنے شوہر کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھا رہی ہے، تو ہرگز اس کا یہ منشا نہیں کہ وہ اپنے

کو شوہر سے زیادہ ذلیل سمجھتی ہے۔ وہ درحقیقت مجبور ہو کر تکالیف برداشت کر رہی ہے وہ شوہر کے نان ونفقہ کی محتاج اور اس کے طلاق سے خائف ہے۔ اور بسا اوقات اولاد کی محبت بھی اس کو مجبور کرتی ہے۔ یہی مجبوری جس کو صبر کے خوبصورت نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں تکلف کا ناسور ہے۔ جس پر "اپنی ضرورت اور دوسروں کی شرم" کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بظاہر تو وہ مندمل ہے۔ لیکن درحقیقت وہ ہر وقت اندر ہی اندر رستا رہتا ہے۔

تکلف ریاکاری ہے۔ اور ریاکاری انسان کا وہ سرطانی زخم ہے جو بالآخر جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔

دیہات اور شہر

دیہاتوں کا آسمان کس قدر صاف اور پانی کتنا شیریں اور ہوا کیسی تازہ اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اور شہروں کی زندگی کتنی چھوٹی اور موت سے کس قدر قریب ہوتی ہے۔ دیہات اچھے ہیں۔ کیونکہ ان پر مناظر قدرت اور سادگی کا قبضہ ہے۔ اور شہر خراب ہیں۔ اس لئے کہ ان میں تکلف اور ریاکاری کا دور دورہ ہے۔

کہاں برقی کارخانوں کی گھڑگھڑاہٹ اور کہاں آبشاروں اور نہروں میں پانی کی آواز۔ کہاں صاف وشفاف فضا میں پرندوں کی پرواز، کھجوروں کے سربلند جھاڑ۔ اور کہاں تاریک فضا میں دھوئیں کا غول کا غول، کہاں سڑکوں کی کیچڑ اور کہاں سبز پودوں کا سادہ فرش، کہاں نالیوں کی گندگی۔ اور کہاں کشت زاروں کے پھولوں کی خوشبو۔ کہاں دیواروں فصیلوں اور عمارتوں سے جگہ جگہ ٹکرانے والی نگاہیں اور کہاں لانہایت فضا تک پہونچ جانیوالی نظریں، کہاں موت کے فرشتوں یعنی موٹروں، گاڑیوں اور ٹراموے کا خوف، کہاں سیدھے راستے پر اطمینان کی چال۔ مختصر یہ کہ شہروں میں حواس پریشان اور افکار میں اضطراب ہوتا ہے، اور دیہاتوں میں جسم فارغ البال اور روح پرسکون ہوتی ہے۔

دیہاتوں میں ہوا کی تازگی اور غذا کی عمدگی کی وجہ سے صحت بہت اچھی رہتی ہے۔ اور سونے جاگنے میں فطری اصولوں کی پابندی دیہاتوں میں تندرستی کو دوبالا کردیتی ہے۔ اور شہروں کی غذا میں خراب آمیزش ہوتی ہے۔ پانی کا مزا بھی بدلا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بہت دور سے زمین کا شکم چیرتا ہوا مکانوں تک پہونچتا ہے شہروں کی فضا باشندوں کی سانسوں سے ملوث ہوتی ہے۔ مکانات اکثر نم اور پھر

تنگ ہوتے ہیں۔ شہری باشندوں کا زیادہ وقت لوگوں کی ملاقاتوں اور باتوں
میں ضائع ہوتا ہے۔

جو لوگ ارادے کے کمزور ہیں اور جن کے دلوں میں مفسدانہ کاموں کی طرف رغبت
ہوتی ہے۔ شہری زندگی ان کو پکا بدمعاش بنا دیتی ہے۔ شہر کے اوباش ان کو برائیوں
کی طرف اس طرح لے جاتے ہیں جیسے مذبح کی طرف بکریوں کو قصاب۔ شہر کی ظاہری
دلچسپیاں ان پر اس طرح حملہ آور ہوتی ہیں کہ وہ سنبھل نہیں سکتے۔ اور نہ مدافعت کرسکتے
ہیں۔ اور اس لئے طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کتاب التربیۃ الاستقلالیہ
کے مولف نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ بچوں کی پرورش دیہاتوں میں کرنی چاہیے
وہ لکھتا ہے کہ شہروں میں ہر ماں اسی کوشش میں ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کو اس کا
بچہ خوبصورت اور صاف وستھرا نظر آئے۔ اب اگر وہ پاؤں پاؤں چلنا چاہتا ہے۔ تو
کوئی اس کو فرط محبت سے گود میں اٹھا لیتا ہے۔ کوئی اس کی واہ واہ کرتے ہوئے
اس کو پیار کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ کسی تنگے کی طرف دوڑتا ہے۔ یا کسی کھیل میں تیزی
سے قدم بڑھا رہا ہے تو کھلانے والی فوراً اس کو پکڑ لیتی ہے۔ کہ کہیں گر نہ جائے
اور اس کے خوبصورت کپڑے میلے نہ ہو جائیں۔ اس احتیاط کی وجہ سے بچہ اپنے
حواس اور اعضا کا آزادی کے ساتھ استعمال نہیں کرتا۔ اور لازمی طور پر لاغر اور کمزور
ہو جاتا ہے۔ اور جو چیز بھی استعمال نہیں کی جائیگی کمزور اور ابتر ہوتی جائے گی۔ اس
طرح کا کمزور بچہ بڑا ہو کر بھی اپنے ارادوں میں مغلوب رہتا ہے۔ اور جو کچھ کرنا یا کہنا
چاہتا ہے اپنی کھلانے والی سے پوچھ کر کرتا یا کہتا ہے۔ ایک بڑا عیب اس میں یہ
پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مغرور بہت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر دم اپنے کانوں سے اپنی تعریف
سنتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں شہری لڑکے بہت سی باتوں سے جاہل اور بےخبر رہتے
ہیں۔ دیہاتی بچوں کو ابتدائی جغرافیہ اور اسباق الاشیاء کی بہت سی باتوں کے

سکھانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ خود اپنے مشاہدات اور ذاتی تجربات سے معلوم کر لیتے ہیں۔ اور جو معلومات از خود حاصل کی جاتی ہیں وہ رٹی ہوئی باتوں سے کہیں زیادہ دیرپا ثابت ہوتی ہیں۔ شہروں میں لڑکوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ آفتاب مشرق سے نکلتا اور مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کو طوطے کی طرح یہی الفاظ رٹائے جاتے ہیں لیکن وہ آس پاس کی اونچی اونچی عمارتوں کی وجہ سے آفتاب کو نہ کبھی نکلتے دیکھتا ہے اور نہ غروب ہوتے۔ مگر دیہاتوں میں لڑکے روزانہ یہ منظر دیکھ سکتے ہیں۔

مجھے اسباق الاشیاء کی کتابوں میں یہ معلومات دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے کہ "اونٹ کے چار پاؤں ہوتے ہیں۔ اس کی پشت پر کوہان ہوتا ہے۔ بلی کے دو آنکھیں اور دو مونچھیں ہوتی ہیں۔ مچھلی کے پر اور چھلکے ہوتے ہیں"۔ یہ چیزیں تو ایسی ہیں کہ لڑکا خود اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ لے۔ ان کا درس دینا اور لڑکوں کے سامنے ان چیزوں کا ذکر کرنا میری نظر میں خود لڑکوں کی توہین کرنا ہے۔ اور ان کا وقت ضائع کرنا۔ اور ان کو اس بات کا عادی بنانا کہ وہ کل کام دوسروں کو سونپ دیں۔ خود کچھ نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے غیر مفید سبقوں میں پھنسا رکھنے سے لڑکوں کو کھیلنے دینا زیادہ بہتر ہے۔ ہاں مگر شہروں کے لڑکوں کے لئے یہ اسباق شاید کچھ مفید ہوں اس لئے کہ اوّل تو یہ جانور شہروں میں بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے شہری لڑکوں کو کسی چیز پر گہری نظر ڈالنے اور جستجو کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ گر ان لڑکوں کی تربیت دیہاتوں میں ہوتی تو ان حیوانات کے متعلق تمام باتیں یا اکثر تو ضرور معلوم ہوتیں۔ اور پودوں اور پتیوں کی نشو و نما، خواص اور دوسرے حالات بھی ذہن نشیں ہو جاتے۔ کھیل کا کھیل ہوتا اور تعلیم کی تعلیم۔

دیہات میں لڑکا آفتاب کے ساتھ سوتا اور جاگتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو کھا لیتا ہے۔ نہ ناشتے کا منتظر رہتا ہے نہ کھانے کا۔ کھیل تماشوں میں جانے اور

شب میں زیادہ زیادہ رات تک جاگنے پر وہ مجبور نہیں۔ اس کو سارے سارے دن کوئی شرابی، پاگل، ٹراموے اور گاڑیوں سے دب کر مرجانیوالا نظر ہی نہیں آتا۔ اس لئے وہ شہری لڑکوں کی طرح بے بھروسہ اور بے اطمینان نہیں رہتا۔ اور نہ بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ میرے قول کی زبردست تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ مصر میں اسوقت جتنے باکمال اور ممتاز افراد ہیں تقریباً سب کے سب انھیں تندرست دیہاتیوں کی اولاد ہیں۔ جن کی استقلالی تربیت نے ان میں سچے ارادے اور خالص عمل کے جذبات بھر دئے ہیں۔ اُمرا اور رئیسوں کی اولاد جو سر سے پاؤں تک شہری ہوتی ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ وہ کسی کام کی نہیں ہوتی۔ اور بہت کم افراد اس میں باکمال نکلتے ہیں۔

دیہاتوں کی زندگی میں عورت کا حصہ لڑکوں سے کسی طرح کم خوشگوار نہیں، اسکی تندرستی اور راحت میں تو اضافہ ہو ہی جاتا ہے گھر کے تمام کاموں اور بعض دوسری محنتوں سے جسم کے اعضا اور جوڑوں میں چستی اور بیداری پیدا ہوجاتی ہے۔ دیہات میں عورت گھر میں سوئی سوئی روٹی والے کا انتظار نہیں کرتی۔ بلکہ خود ہی تیار کرلیتی ہے شہروں میں عورتیں سُست اور کاہل ہوجاتی ہیں۔ اس لئے کہ تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے وہ کل کام دوسروں سے لے سکتی ہیں۔ چنانچہ وہ خود اپنے کپڑے نہیں سیتیں کیونکہ شہر میں درزی بہت ہیں۔ گھر کی صفائی اور ترتیب بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ شہر میں نوکرانیاں کافی ہیں۔ اگر یہ عورتیں دیہاتوں میں قیام کریں تو یقیناً چست اور شگفتہ ہوجائیں۔ اور اہل شہروں میں رئیس کی زبردست بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ مردوں کو اس سلسلہ میں لبا او قات ناقابل برداشت مصارف اٹھانے پڑتے ہیں۔

ہمارے یہاں شہروں میں عورتیں کرتی کیا ہیں؟ میں دیکھتی ہوں کہ وہ اپنے دامن سے سڑکوں پر جھاڑو دیتی پھرتی ہیں۔ اور زمین کے جراثیم ہر طرف اڑاتی رہتی

ہیں۔ ان کا سارا وقت ملنے والیوں کا استقبال کرنے اور ملاقاتیوں سے ملنے جانے میں ضائع ہوتا ہے۔ بعض تو تھیئٹروں اور تماشوں میں اپنا وقت گذارتی ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ ڈراموں سے کوئی اخلاقی یا تاریخی نتیجہ نہیں نکالتیں۔ بلکہ اکثر نفسانی اور ہوس رانی کا سبق لے کر نکلتی ہیں۔

شہری اور دیہاتی عورتوں کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ دونوں کے اخلاق اور صحت میں بڑا فرق ہے۔ شہری عورت سست بیمار جیسی بنی رہتی ہے۔ اور دیہاتی چست اور تندرست شہری عورت برقعہ ڈال کر چلتی ہے، لیکن بدمعاشوں کو نظر آتی ہے دیہاتی عورت بے نقاب دوڑتی ہے، لیکن کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

بہت سی عورتیں میں نے ایسی دیکھی ہیں جو ایک ہفتہ سے زیادہ دیہاتوں میں قیام نہیں کر سکتیں۔ مجھے ان پر سخت تعجب ہوتا ہے۔ یہ وہ خواتین ہیں جو سوسائٹی والی کہلاتی ہیں۔ ان کو یہی مرغوب ہے کہ محفلیں ہوں اور ان کے کپڑوں اور زیوروں کا تذکرہ، مجالس ہوں اور ان کے حسن و جمال کی تعریف، اس قسم کی خواتین اپنی جوتیوں میں تو ہیرے اور جواہر ٹکواتی ہیں۔ لیکن بدنصیب بھوکوں مرنے والی غریب خواتین کا ان کے دل میں خیال تک نہیں آتا۔ اگر ان کی زندگی کے دن دیہاتوں میں گذرتے تو یقیناً ان میں یہ امیرانہ نخرے نہ ہوتے۔ اور وہ اپنے گرد و پیش بسنے والی محتاج کسان عورتوں کی امداد کرتیں۔ خوبیوں والی وہی خاتون ہے جو دوسروں کو فائدہ پہونچائے۔ نہ وہ جو رنگین اور ریشمی کپڑوں میں شکتی پھرے۔ ان باتوں پر ہماری خواتین کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ جو دیہاتوں سے محض اس لئے بیزار ہیں کہ وہ کسانوں کی بستی ہے

ایک بصیرت افروز تقریر

قومی مجلس کے ایک اجلاس میں سینکڑوں خواتین کے سامنے باحثۃ البادیہ نے ایک پر مغز تقریر کی جس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں :-

خواتین !

ہمارا آج کا اجتماع محض تعارف یا اپنے مختلف لباسوں اور زینتوں کی نمائش کے لئے نہیں ہے ۔ بلکہ اس سنجیدہ اجتماع کا مقصد ایک ایسی راہ کی تلاش ہے جس پر چل کر ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں کی اصلاح کر سکیں ۔ مردوں سے ہماری شکایتوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ۔ اسی طرح مرد بھی ہم سے عام طور پر شاکی ہیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنے دعوے میں سچا کون ہے ؟ لیکن کیا محض شکایتوں کے اظہار سے اصلاح ہو جائیگی ؟ آج تک کوئی مریض محض کراہنے اور درد کی بیتابیوں کے اظہار سے شفایاب نہیں ہوا ۔ عربی مثل ہے لا دخان بلا نار ، یعنے آگ کے بغیر دھواں نہیں نکلتا ۔ انگریز فلسفی ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ " جن خیالات کو ہم غلط سمجھ رہے ہیں ممکن نہیں کہ وہ سرتاپا غلط ہوں یقیناً ان میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہوتی ہے ۔ اس اصول پر مرد اور ہم دونوں اپنے اپنے دعوے کی صحت اور بطلان میں برابر ہیں ۔ دونوں مظلوم بھی ہیں اور دونوں حق پر بھی ، ہم میں اور مردوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے ۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہم میں باہمی اتحاد اور موافقت بہت کم ہے ۔ مرد اس ناچاقی اور بیگانگی کی وجہ ہماری ناقص تربیت اور تعلیمی خرابی بتاتے ہیں ۔ اور ہم مردوں کی انانیت اور سرکشی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں ۔ ہمارے اسی باہمی اختلاف نے زندگی تلخ کر رکھی ہے ۔ اور مرد و عورت کے مابین عداوت کی خلیج میں وسعت پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے ۔ ہم اس اجنبیت کو

کسی طرح اچھی نظروں سے نہیں دیکھتیں۔ بلکہ ہم کو اس پر افسوس ہے۔ اللہ نے مردوں اور عورتوں کو باہمی ناچاقی اور نفرت کیلئے پیدا نہیں کیا۔ اس کے پیدا کرنیکا مقصد تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے سکون اور اطمینان حاصل کریں۔ تاکہ کائنات آباد ہو دنیا کی آبادی دونوں کے اتحاد میں ہے۔ اگر مرد اور عورت دونوں علیحدہ ہو جائیں تو دونوں فنا ہو جائیں گے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورت مرد علیحدہ علیحدہ رہکر دنیا میں اپنی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرد میں بقا کی صلاحیت ہے اس لئے کہ وہی تمام محنت کے بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں۔ مکانات تعمیر کرتے ہیں، ایجادات واختراعات کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تو میں کہوں گی کہ اگر عورتیں بقائے نسل کے لئے نہ ہوں تو مرد یہ سارے محنت کے کام کیوں اور کس کے لئے انجام دیگا۔ اور اگر کہا جائے کہ عورت میں بقا کی صلاحیت ہے اس لئے کہ وہ گھروں کی ناظم اور اولاد کی ماں ہے تو میں سوال کروں گی کہ اولاد ہی کہاں سے آئیگی جبکہ اس کے باپ کا وجود تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہ قیاس دنیا کے موجودہ نظام طبعی پر ہے۔ اور کسی دوسرے نظام فطرت کے فرض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ سوائے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی شاذ مثال کے یہی نظام توالد قائم ہے۔ کائنات میں عورت اور مرد کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ جسم کے لئے کھانے پینے کا۔ یا زراعت کیلئے دھوپ اور پانی کا۔ تمام آسمانی کتابیں اس پر متفق ہیں کہ انسان کی اصل آدم و حوا ہیں۔ ڈارون کے ہم عقیدہ لوگ بھی اُن ابتدائی حیوانات میں نر و مادہ کی ضرورت کا انکار نہیں کرسکتے جن کے توالد سے حیوان تدریجی ترقی کرتا ہوا انسان کی صفت تک پہونچا ہے۔ یہی حال ہر جاندار اور نشو ونما پانے والی چیزوں کا ہے۔ نباتات میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں پھولوں کے خوبصورت اور لطیف جسم کی بھی رنگوں کے اختلاف سے دو شکلیں

پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ ایک میں وہ دانے پیدا ہوتے ہیں جن میں اپنی نسل باقی رکھنے کی قوت پوشیدہ رہتی ہے۔ اللہ نے ان پھولوں پر ہوا کے جھونکے مسلط کر دئے ہیں۔ تاکہ وہ ان میں پیدا ہونیوالے دانوں کو زمین پر منتشر کر دیں۔ یہی دانے بادلوں کی دریا دلی سے تری پاکر اُگتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ توالد اور تناسل کا یہ نظام انسان تو کیا حیوانات اور نباتات تک میں جاری ہے۔ لہذا عورتوں کو مردوں سے یا مردوں کو عورتوں سے مستقلاً جدا رکھنے کا خیال محال ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو کیوں عورتوں اور مردوں میں قلمی جنگ جاری رکھنے دی جائے۔ اور کیوں نہ دونوں کو متحد کرنے کی امکانی کوشش کی جائے۔ اور دونوں کے دلوں سے بدگمانیاں دور کر کے الفاف اور اعتماد کے جذبات پیدا کیئے جائیں۔ اس کے لئے ہمکو سب سے پہلے طرفین کے نقطۂ اختلافات سے بحث کرنی چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم تعلیم پاکر مردوں سے ان کے کاموں میں مقابلہ کرنے لگیں گی۔ اور اپنے کام چھوڑ دیں گی۔ جن کے لئے خدا نے ہمکو پیدا کیا ہے۔ مگر کاش مجھے کوئی بتاتا۔ کہ اس جرم کی ابتدا کس نے کی؟ عورت پہلے زمانے میں چرخہ چلاتی، سوت کاتتی اور کپڑے تیار کرتی تھی۔ مردوں ہی نے سوت کاتنے اور کپڑے تیار کرنے کے آلات ایجاد کر کے اسکو معطل کر دیا۔ اور اس قسم کے تمام کام اس کے ہاتھ سے نکل گئے اگلے زمانے کی عورت گیہوں چالتی پھٹکتی اور پیستی تھی۔ پھر آٹا چھان کر روٹی پکاتی تھی۔ مردوں ہی نے تنور کی ایجاد کی اور تنور خانوں میں مردوں کو ملازم رکھ کر عورتوں کے بہت سے کام چھین لئے۔ اور بیکار کر دیا۔ عہد ماضی میں عورت اپنا اور گھر والوں کا کپڑا اپنے ہی ہاتھوں سے سی لیتی تھی۔ مردوں نے سینے کی مشین ایجاد کی، اور ستم بالائے ستم یہ کہ مردوں ہی کی ایک قوم بنائی درزی۔ کارخانوں میں

مشین تیار کرنیوالے بھی مرد، بازاروں میں، دوکانوں پر مشین چلانے والے بھی مرد، اب
ہمارے اور ہماری اولاد کے کپڑے بھی مرد ہی سیتے ہیں۔ بہرحال اس کام سے بھی ہمکو محروم
کر دیا گیا۔ غریب عورتیں اور گھر کی نوکرنیاں اپنے اور اپنے مالک کے گھروں کے لئے پانی
لایا کرتی تھیں۔ مردوں نے پانی کے لئے نل بنائے جن سے بڑی آسانی کے ساتھ پانی گھر
میں پہونچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی منزل یا نیچے کے طبقے میں نل ہوتے ہوئے کوئی عقلمند
عورت نہر پہ پانی لانے نہیں جائے گی۔ اور پھر جب کہ نہر دور بھی ہو۔ اسی طرح کوئی شہری
عورت تنور کی صاف اور تازہ روٹی ارزاں قیمت میں ملتے ہوئے آٹا چھاننے، گوندھنے اور
پھر روٹی پکانے کی تکلیف نہیں اٹھائیگی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ کمزور اور تنہا بھی
ہو۔ میں خیال کرتی ہوں کہ اگر ہماری جگہ مرد ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے جو آج عورتیں کر رہی
ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں اب تک تمدن کا سایہ نہیں پڑا ہے۔ آج بھی دیہاتی عورتیں پہلے
زمانے کی عورتوں کی طرح سب کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔

میں مردوں کی اُن اختراعات اور ایجادات کی مذمت کرنا نہیں چاہتی جو عام طور سے
مفید ہیں۔ نہ یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ اختراعات ہماری ضرورت سے زیادہ ہیں۔ بلکہ اس
تفصیل سے میرا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ مقابلہ کرنیکا جرم مردوں
نے شروع کیا۔ اب اگر ہم آج بعض کاموں میں مردوں کے بالمقابل ہونا چاہتی بھی ہوں تو
یہ مکافات عمل ہوگی۔

اور پھر مقابلہ کی بات تو شخصی آزادی سے متعلق ہے۔ مثلاً احمد طبابت کرنا اور حکیم
بننا چاہتا ہے۔ اور محمود کی خواہش ہے کہ وہ تاجر بنے۔ تو کیا ہمکو یہ حق ہے کہ احمد کو
طبابت سے روکیں۔ اور تجارت شروع کرنے پر اس کو مجبور کریں۔ اسی طرح کیا ہم
محمود کو تجارت چھوڑ کر حکیمی کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہر شخص کو آزادی
ہے جس کا جی جو چاہے کرے۔ جب ایجاد کرنیوالوں نے ہم کو بہت سے کاموں سے

محروم کردیا ہے۔ تو اب ہم اپنا وقت سستی اور کاہلی میں ضائع کریں۔ یا کوئی ایسا کام تلاش کریں جس میں اپنا وقت کاٹیں۔ ہمارے خانگی کام اب اس قدر مختصر ہو گئے ہیں۔ کہ آدھے دن میں ہم سب کاموں سے فراغت پا سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں آدھا دن اگر ہم تعلیم حاصل کرنے میں گذارنا چاہیں تو مردوں کو یہ کہکر رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ کہ پڑھ لکھ کر عورتیں ہماری راہ میں مزاحم ہوں گی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں امور خانہ داری اور بچوں کی تربیت چھوڑ کر وکالت اور ججی کی تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ یا ریلوے میں ملازمت کی تلاش شروع کردیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی خاتون ان کاموں کی طرف رغبت رکھتی ہے، تو اس کو اس کی پوری آزادی حاصل ہے، اور کسی کو یہ حق نہیں۔ کہ اس کو ان کاموں سے روکے۔ حمل اور زچگی کو بعض لوگ ہمارے خلاف دلیل میں پیش کر سکتے ہیں۔ کہ اس کی وجہ سے ہمکو مجبوراً کام چھوڑنا پڑے گا۔ مگر میں کہتی ہوں کہ عورتوں میں ایسی بھی تو ہیں جنھوں نے شادی ہی نہیں کی۔ ایسی بھی تو ہیں جن کی قسمت میں اولاد ہی نہیں۔ ایسی بھی تو ہیں جو بیوہ یا مطلقہ ہونے کے بعد کسی کے دامن سے وابستہ نہو سکیں ایسی بھی تو ہیں جن کے شوہر ان کی امداد کے محتاج ہیں۔ اس قسم کی خواتین اگر کوئی پیشہ اختیار نہ کرنا چاہیں اور ان کی خواہش ہو کہ وہ استانیاں بن جائیں، ڈاکٹری سیکھ لیں۔ اور مردوں کی طرح علوم کی سندیں حاصل کریں تو کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان کو منع کردیا جائے۔ اور اپنی معاش کیلئے جن وسائل کو وہ مناسب جانتی ہیں ان سے ان کو باز رکھا جائے۔ اور پھر حمل اور زچگی کے ایام میں اگر خواتین بیرونی کاموں سے معذور ہو جاتی ہیں، تو خانگی کاموں سے بھی بدستور مجبور ہو جاتی ہیں۔ اور مردوں میں ایسا کون تندرست اور قوی مرد ہے جو اپنے کاموں سے بیماری یا اور کسی وجہ سے غیر حاضر نہیں ہوتا؟

مرد ہم سے کہتے ہیں اور دلی یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم گھر کے لئے پیدا کیگئی ہو۔ اور ہم کسب معاش کے لئے۔ مگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ خدا کی طرف سے ایسا کونسا

فرمان صادر ہوا ہے۔ جس پر تم کو اس درجہ یقین ہے۔ خدا کی کتاب میں اس قسم کا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ ہاں سیاسی اقتصاد کا تقاضا ہے کہ کاموں کی تقسیم کر دی جائے۔ لیکن ہم میں سے بعض خواتین علوم و فنون میں مصروف رہنا چاہتی ہیں۔ تو اس سے تقسیم عمل کے اصول میں کیا خلل پیدا ہو جائیگا۔ اور میں تو یہ کہتی ہوں کہ مرد اور عورتوں میں تقسیم عمل ایک اختیاری بات ہے۔ اگر آدم علیہ السلام اپنے ذمے پکانے دھونے کا کام لیتے اور حوا کسب معاش کی ذمہ وار ہو جاتیں، تو بھی نظام ابتک جاری ہوتا۔ پھر تو مردوں کو اس استدلال کی ہمت نہ پڑتی۔ کہ عورتیں صرف گھروں کیلئے پیدا کیگئی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہاتی کسانوں اور بربری قوموں میں ایسی عورتیں اب بھی موجود ہیں جو کھیتی باڑی کے سارے کام خود انجام دیتی ہیں۔ درختوں پر چڑھکر پھل توڑتی ہیں۔ اور مرد گھر کے کام کرتے ہیں۔ ہم میں سے جن کا اتفاق دیہاتوں میں جانیکا ہوا ہے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اس کے باوجود ان عورتوں کی اولاد نہایت قوی اور تندرست رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم عمل ایک اختیاری اور اصطلاحی بات ہے۔ اور ہم اگر کمزور ہیں تو اس لئے کہ محنتی کاموں کی ہم کو مشق نہیں۔ ورنہ مرد عورت یکساں ہیں اور اس کے ثبوت میں دیہاتی عورت پیش کی جاسکتی ہے۔ جو محض مشق کی وجہ سے اپنی شہری بہن سے بہت زیادہ قوی ہوتی ہے۔

ہم ابھی لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کے دور میں ہیں۔ ابھی سے یہ بحث کہ لڑکیوں کی تعلیم کس حد اور کس درجہ تک ہونی چاہیئے۔ ہماری ہمتوں اور حوصلوں کو پست کر دیگی۔ اور ہم الٹے پاؤں پیچھے آنے لگیں گی۔ مردوں کو ابھی ہمارے مقابلے کے خیال سے خوف نہیں کھانا چاہیئے ابھی تو ابتدائی تعلیم کی منزل بھی ہم نے طے نہیں کی ہے۔ ابھی مشرقی عادتیں ہمکو قدم قدم پر اعلیٰ تعلیم سے روک رہی ہیں۔ جب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قانون۔ ڈاکٹری اور ریاضی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہماری کرسیاں خالی ہیں اس وقت تک مردوں کو بلا خوف

وخطر اپنی ملازمتوں اور عہدوں پر خوش رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ مقابلے کا دن ابھی بہت دور ہے۔ اور بالفرض اگر کوئی خاتون تکمیل تعلیم کے شوق میں آگے بڑھتی ہی جارہی ہے تو میں پورے وثوق کے ساتھ یقین دلاتی ہوں کہ وہ کسی اعلیٰ ملازمت کے خیال سے ڈگری حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ یا تو تعلیم کے شوق میں ایسا کر رہی ہے۔ یا پھر حصول شہرت کے خیال سے۔ اب جبکہ ہم وکالت اور بیرسٹری کرنا نہیں چاہتیں۔ اور نہ حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں اور عہدوں کی طلبگار ہیں۔ تو کیا اتنی تعلیم سے بھی ہمکو محروم رکھا جائیگا۔ جو اولاد کی بہترین تربیت اور معمولی نوشت خواند کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ علاوہ ازیں ماں کی تعلیم جس قدر بھی ہوتی ہے اور جو ہنر بھی اس کو آتا ہے وہ اپنی اولاد کو ضرور سکھاتی ہے یقیناً وہ جس قدر روشن خیال ہو گی اپنی ذمہ داریوں کو اسی قدر زیادہ محسوس کرے گی۔ دیہاتی عورتوں کو ہم دیکھتی ہیں کہ ان میں سے کسی کا لڑکا گھنٹوں کھڑا رونا رہتا ہے۔ اور وہ نہ سنتی ہیں اور نہ اپنی جگہ سے ہلتی ہیں۔ تو کیا یہ عورتیں بھی وکیل و بیرسٹر ہیں۔ اور ان کو بھی لکھنے پڑھنے سے فرصت نہیں رہتی۔

مجھے اس بات سے زیادہ غصہ کسی پر نہیں آتا کہ مرد ہمکو شفقت اور رحم کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہماری جگہ ان کی نگاہوں میں شفقت کی نہیں احترام کی ہے۔ ان کو ہمیں رحم کی نہیں احترام کی نظروں سے دیکھنا چاہیئے۔ رحم اور شفقت کا اظہار تندرستوں کی طرف سے بیماروں پر اور بڑوں کی طرف سے حقیروں پر ہوتا ہے۔ مرد ہمکو کیا سمجھتے ہیں؟ ہمکو اپنے بیمار ہونے سے بھی انکار ہے اور حقیر ہونے سے بھی۔

خواتین!

علم بہرحال عقل کو روشن کرتا ہے۔ خواہ اس پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگر ہم دنیا بھر کی سیاحت نہ بھی کرنا چاہیں تو اس میں کیا نقصان ہے۔ کہ ہمکو تمام ملکوں کے محل وقوع اور مسافت کا علم حاصل ہو۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنی تعلیم کے زمانہ میں جبر و مقابلہ

سیکھتے ہیں۔ لیکن ان کو طبابت اور ڈاکٹری میں کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہم سب
کی سب سیاسی خبروں سے باخبر رہنا چاہتی ہیں۔ اور بہت سے لوگ سیاسیات میں حصّہ لیتے
ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی مقتول بادشاہ یا معزول خلیفہ کے تخت یا خلافت
کا اپنے کو حقدار نہیں کہتا۔ تو کیا ہم ان سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ جب تم اقوام اور ممالک
کے مالک بننا نہیں چاہتے تو کیوں ان کی سیاست اور ان کے حالات سے دلچسپی لیتے ہو۔
کیوں ان کے واقعات معلوم کرنا چاہتے ہو۔ آج کل کی سیاسی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ
ترکوں کی دستوری فوج سلانیک سے آستانہ کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ اور اس کو دار
کے قلعہ پر اب تک قبضہ نہیں ہوا۔ کیا ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ جغرافیہ کی مدد سے
ہم ان خبروں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر علم میں ذاتی طور پر کوئی لذّت اور دلکشی نہ ہوتی
تو کبھی بادشاہ اس کے حصول میں مشغول نہ رہتے۔ حالانکہ ان کو یقین ہے کہ ان کو نہ
انجینیئر بننا ہے، نہ جہازوں اور ریلوں میں ملازمت کرنی ہے۔ وہ عورت جو آلو پکانا اور گلدستہ
بنانا جانتی ہے افضل ہے یا وہ جو یہ دونوں کام تو جانتی ہی ہے۔ ساتھ ہی اس کو یہ بھی
معلوم ہے کہ آلو کب کھانا چاہیئے۔ اور اس کے مریض شوہر کے مزاج کے موافق ہوگا یا
نہیں۔ ہمکو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری اور ہمارے نوجوانوں کی خراب تربیت کی ذمہ داری
ہماری جاہل ماؤں پر ہے۔ پھر مرض معلوم ہونیکے بعد بھی ہم علاج نہیں کرتے۔ حدیث شریف
میں آیا ہے کہ ایماندار ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ ہمارے مدرسے اور
تعلیمگاہیں بچوں کو مہذب اور تعلیمیافتہ بنانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں لیکن گھر کا
بھی ان پر خاص اثر ہوتا ہے۔ بچے کو اگر معلوم ہے کہ اس کی ماں پڑھی لکھی ہے تو وہ اس
بات کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اپنے کو ماں کی نظروں میں محبت اور پیار کا زیادہ سے زیادہ
مستحق ثابت کرے۔ ہماری موجودہ تعلیم ناقص ہے۔ اس میں اضافے کی ضرورت ہے نہ کہ
اور کم کر دینے کی۔

مردوں کو ہماری جن کمزوریوں کی شکایت ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کو بتایا جاتا ہے حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ان کا تعلق تربیت سے ہے۔ بہتوں کی رائے ہے کہ علم لوگوں کو نیک اور تہذیب یافتہ بناتا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ نہیں ہے۔ اور میں صاف صاف کہنا چاہتی ہوں کہ دینی علوم کے علاوہ ہر علم تربیت سے علیحدہ ایک مستقل چیز ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے اہل علم غیر مہذب ہیں۔ اور یہ کہ ایک ہی کتاب دو جماعتوں میں دو معلموں کی تعلیم سے بچوں میں مختلف اثر پیدا کرتی ہے۔ ایک جماعت کے بچوں میں اسی کتاب کی تعلیم سے اچھے اخلاق اور بلند ہمتی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری جماعت میں کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ یہ فرق معلم کی قوت تاثیر سے پیدا ہوا ہے۔ نہ کہ علم سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہترین تربیت اسی کا نام ہے کہ ملاقات کرنیوالوں کے ہاتھ چوم لئے جائیں۔ یا ان کے سامنے ہاتھ باندھکر کھڑے رہیں۔ یہ خیال غلط ہے اچھی تربیت حقیقت میں نام ہے اپنا صحیح اندازہ لگانے کا۔ اچھی تربیت بچپن ہی سے انسان کو اس کا عادی بناتی ہے کہ وہ قابل احترام انسانوں کی عزت کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ لڑکیوں کے اخلاق میں خرابی تعلیم نے پیدا نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کی ساری ذمہ داری خراب تربیت پر ہے۔ اور تربیت کا تعلق گھر سے ہے۔ مدرسہ سے نہیں۔ اور چونکہ ہمارے گھروں کی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ ان کے ذریعے بہترین تربیت حاصل ہو سکے۔ اس لئے ہم کو خود اپنی اصلاح کے لئے زبردست کوششیں کرنی چاہئیں۔ اور اس کے بعد اولاد کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اور یہ سب کے سب کام تھوڑی مدت میں نہیں ہو سکتے، جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے، مدارس کا اثر تربیت پر پڑتا ضرور ہے لیکن اتنا نہیں جتنا گھروں کا۔ اس لئے ناقص تربیت کی ساری ذمہ داری مدارس پر ڈالدینا کھلا ہوا ظلم ہوگا۔

اس کے بعد موصوفہ نے لباس اور پردے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

عورتوں کے عیوب اور کمزوریوں پر روشنی ڈالی ہے اور آگے چلکر فرماتی ہیں کہ
مجھے یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے کہ مرد ہمارا احترام جیسا چاہئے نہیں کرتے۔ لیکن
اگر ہم اس مسئلہ پر گہری نظر ڈالیں تو ہمکو معلوم ہوگا کہ ہم خود اپنی پستی اور تحقیر پر راضی ہیں
اور ہمارے خیالات اور افکار ہی اس قابل ہیں کہ ہمکو کوئی وقعت نہ دی جائے۔ جو عورت
دن رات جادو منتر، تعویذ گنڈوں کے پیچھے پڑی رہے گی۔ جس کی زبان پر ہر دم کسی کے
لباس اور کسی کے زیور کی داستان ہوگی، جو دن رات کسی کے جہیز ہی کے اُدھیڑ بن میں
لگی رہتی ہے، اور جس کے دماغ میں اچھی طرح جم چکا ہے کہ عورت کمزور اور کمتر درجے
کی ہے۔ بھلا مرد اس کا احترام کیوں کریں گے۔ اگر ہم کو مردوں کی نظر میں با عزت اور قابل
احترام بننا ہے تو اس کے لئے صحیح تعلیم اور صحیح تربیت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ہمکو
سستی اور کاہلی ترک کرنی ہوگی۔ اور ہماری تو حالت یہ ہے کہ گھر میں پلنگ پر بیٹھی بیٹھی
فضول گپ شپ میں اپنی عمریں برباد کر رہی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو اگر کچھ پڑھنا بھی آتا
ہے تو وہ مفید کتابوں کو چھوڑ کر ناول اور افسانے پڑھتی رہتی ہے۔ جرمن قوم اپنی
خواتین کی محنت اور صحت کی وجہ سے دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ ہر سال اس کی مردم شماری
میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ ان کو نئی نئی آبادیاں بسانے کی فکر ہوگئی ہے۔ جرمنوں کے
بالمقابل فرانسیسی قوم اپنی خواتین کی عیش پسندی اور کاہلی سے، روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے
کیا اس کے بعد بھی ہم گھروں میں بیکار بیٹھکر کاہلی سے اپنی صحت کو برباد کرتی رہینگی؟

میں نے دیہاتوں میں بچشم خود ایسی معمر بوڑھی عورتوں کو دیکھا ہے، جو نہایت
تندرست ہیں اور اپنی اولاد کی چوتھی پشت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔ قاہرہ اور
دوسرے شہروں میں اس کی ایک مثال ملنی دشوار ہے۔ اتنی طویل عمریں پاکر بھی تندرست
رہنا حقیقت میں اس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اعتدال اور طبعی اصول
کی پابندی کی۔ عموماً دیہاتی ہر کام میں چستی اور عجلت کے عادی ہوتے ہیں۔ سونے

جا گنے اور کھانے غرض ہر کام میں عجلت اور سرگرمی کی ان میں عادت ہوتی ہے۔ وہاں تو لوں میں ایک عورت بھی آپ کو بیکار اور کاہل نہیں ملے گی۔ اطبا اور ڈاکٹر "اکسیر زندگی" کے نسخے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مگر میں نے اس کا انکشاف کر لیا ہے۔ اور برملا سب کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ انسان کیلئے اکسیر حیات یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں "اعتدال اور محنت" سے کام لے

اگر مجھے قانون سازی کا حق حاصل ہوتا تو میں خواتین کی تربیت و تعلیم کے لئے حسب ذیل دستور العمل مرتب کرتی اور اس پر عملدرآمد کرنے کے احکام نافذ کرتی۔

دفعہ ۱۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں لڑکیوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام

دفعہ ۲۔ لڑکیوں کے لئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام اور ہر طبقے میں ابتدائی تعلیم کے لئے جبریہ نظام تعلیم کا نفاذ

دفعہ ۳۔ امور خانہ داری کی علمی اور عملی تعلیم نیز تربیت اولاد و حفظان صحت اور وقتی طبی امداد کی تعلیم کا انتظام۔

دفعہ ۴۔ فن تعلیم اور فن طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے لڑکیوں کی ایک جماعت کا انتخاب تاکہ ملک کی تمام نسوانی ضروریات بآسانی پوری کی جاسکیں۔

دفعہ ۵۔ خواتین کی درخواست پر دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کی اجازت۔

دفعہ ۶۔ لڑکیوں کو بچپن ہی سے سچائی، محنت اور صبر و استقلال وغیرہ اخلاق حسنہ کی عادی بنانے کا انتظام

دفعہ ۷۔ منگنی اور شادی کے مواقع پر شرعی طریقے کی پابندی کا حکم یعنی محرم کی موجودگی میں دونوں اکٹھا ہولیں پھر شادی کی جائے۔

دفعہ ۸۔ باہر نکلنے اور لباس و پردے کے بارے میں ترکی خواتین کی اتباع[1]

---

[1] باحثۃ البادیہ نے لباس اور پردے کے متعلق جہاں کہیں اظہار خیال کیا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵ پر)

دفعہ ۹۔ وطنی مصلحت کی حفاظت، اجنبی مردوں اور اجنبی چیزوں سے حتی الامکان علٰحدگی اور بیزاری۔

دفعہ ۱۰۔ ان دفعات کا اجرا مردوں پر فرض ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲) وہاں اس نے ترکی خواتین کے لباس اور پردے کی تعریف کی ہے۔ اور عام خواتین کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس معاملہ میں ترکوں عورتوں کی تقلید کریں۔ مگر موصوفہ کو کیا معلوم تھا۔ کہ ۱۵۔۲۰ برس کے بعد ترکی خواتین کے اس برقعہ اور لباس میں تبدیلی ہو جائے گی۔ مترجم۔

مشرق و مغرب کا نسوانی موازنہ

باحثۃ البادیہ کی ایک اور تقریر

بہنو اور بیگمو!

اگر کسی جماعت کے لئے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ اکٹھا جمع ہو کر اپنے حالات پر غور کرے۔ اور اپنی صلاح و فلاح کی تدبیریں سوچے تو وہ ہم مصری خواتین کی جماعت ہے، اس لئے کہ ہماری ہی جماعت پستی کے اس درجہ پر ہے جہاں پہنچکر ایک غور کرنے والے کو دلی تکلیف ہوتی ہے۔ اور وہ محسوس کر لیتا ہے کہ ابھی وطن ترقی کی منزلوں سے کوسوں دور ہے۔ ہماری پستی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ہماری اکثریت بلا سوچے سمجھے یورپین لیڈیوں کا سا رنگ روپ اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سرسری نظر بھی اس بات پر نہیں ڈالنا چاہتیں کہ یورپ کا فیشن کہاں تک اسلامی عادات اور مشرقی آداب کا ساتھ دیتا ہے۔ ہم میں ایک جماعت ایسی بھی ہیں جو اپنی قدیم عادات پر جمی ہوئی ہے۔ اس کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ کہ یہ قدیم عادتیں اور پرانی رسمیں صحیح ہیں یا غلط، اچھی ہیں یا بُری۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس ٹیلے پر اڑے رہنا اچھا ہے اور نہ اس سیلاب میں بہہ جانا۔ سردست میں اپنی تقریر میں مغرب اور مشرق دونوں کا نسوانی موازنہ کر کے زندگی کے ہر دور کے حالات پیش کروں گی۔ اس موازنہ سے یقیناً وہ نتائج پیدا ہوں گے جن سے ہمارا مستقبل فائدہ اٹھا سکے۔

دورِ ولادت

لڑکیوں کی پیدائش کی اطلاع ملنے کے موقع پر ہماری حالت عہد جاہلیت کے عربوں سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ اور ہم زندہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عربوں کی کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

"اور جب ان میں سے کسی ایک کو لڑکی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی تو اس کے چہرے پر سیاہی دوڑ جاتی۔ اور وہ غصہ میں پیچ و تاب کھاتا اور اپنی قوم سے اس اطلاع کی شرم کے مارے منہ چھپاتا پھرتا۔ کہ اس کو ذلیل زندہ رکھے یا زمین میں گاڑ دے، برا فیصلہ کرتے ہیں۔"

لڑکیوں کی پیدائش کے وقت ہم جس کراہت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اس کا اثر بچے پر بہت برا پڑتا ہے۔ چنانچہ لڑکیاں عہد طفلی ہی سے یقین کر لیتی ہیں کہ وہ بے وقعت اور ذلیل ہیں۔ ان کے دماغوں میں یہ خیال پہلے ہی سے جم جاتا ہے کہ ان کے اور لڑکوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ اس پستی اور بے وقعتی کے اعتقاد کی بنا پر وہ ان خوبیوں اور کمالات کے حاصل کرنے کا خیال تک دلوں میں نہیں لاتیں۔ جن کے حاصل کرنے کے جذبات سے ان کے بھائیوں کے دل لبریز ہوتے ہیں۔ کاش مجھے کوئی بتاتا۔ کہ ہم کیوں لڑکیوں کے پیدا ہونے پر آزردگی اور ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ وہ نصف انسان ہے۔ بلکہ انسان کی ماں، اس کی بیوی اور اس کی بیٹی ہے۔ کیا وہ لڑکوں کی طرح نفع بخش ثابت نہ ہو سکے گی؟ کیا مردوں کے عیش و مسرت کا زیادہ تر دارومدار عورتوں کے وجود پر نہیں؟ کیا بسا اوقات عورت کی وجہ سے مرد کی مردہ امیدوں میں زندگی

کی روح پیدا نہیں ہوگئی ؟ کیا اکثر مرد عورت کی وجہ سے خوش نصیب اور سعادتمند نہیں بن گیا ؟ پھر کیوں اس کی ولادت سے بیزاری کا اظہار کر کے ہم اپنے پاک مذہب کی تعلیم سے روگردانی کر رہے ہیں۔ حالانکہ مغربی تو میں آج اسی تعلیم پر عمل پیرا ہیں۔

یورپ کی اکثریت خصوصاً اس کی شمالی قومیں لڑکوں اور لڑکیوں میں کچھ فرق نہیں کرتیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں بہت سی لڑکیاں ایسی پیدا ہوئیں جنھوں نے مشرقی قوموں کے اس خیال کی عملی تردید کردی کہ بیٹے کے وجود سے خاندان کا نام باقی رہتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ خاندانوں کی بقا اور فنا کا دارومدار عمل پر ہے، خدا نے انبیا علیہم السلام کے درجات ان کے اعمال کی بنا پر بلند کئے، بیٹوں کے وجود سے نہیں۔ ورنہ بعض نبی تو ایسے ہیں جنھوں نے شادی ہی نہیں کی، بعض ایسے ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو عاق کر دیا۔ ابوالعلا معرّی جس کے فضل و کمال اور جس کی علمی و ادبی شہرت کا ڈنکا آج تک بج رہا ہے ان لوگوں میں تھا جو شادی اور اولاد کو جرم سمجھتے ہیں۔ پھر کس اولاد نے اس کا نام روشن رکھا؟ واقعہ یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں باپ کی آنکھوں کی اس کی زندگی بھر ٹھنڈک ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد دونوں کا حشر کیا ہوگا ؟ کون اس کی ضمانت دلیسکتا ہے کہ والد کی دولت کا وارث ہونے والا لڑکا اپنی فضول خرچیوں سے خاندان کی ساری ثروت تباہ نہیں کر دیگا ؟ اور کون اس کا ذمّہ لے سکتا ہے کہ اگر کسی کے سب لڑکے ہی پیدا ہوئے۔ تو اس کو دوامی حیات حاصل ہو جائے گی ؟

دور طفلی

اس دور میں پہنچکر ہی ہم لڑکوں کو بہت سی باتوں میں فضیلت دینے لگتے ہیں

حالانکہ یورپین قومیں دونوں کی تربیت اور پرداخت یکساں کرتی ہیں۔ اور لڑکی لڑکے میں کوئی فرق نہیں کرتیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ لڑکوں ہی میں سے اگر کسی کو غیر نظر سے دیکھتی ہیں تو اس کی تربیت اور تعلیم سب کچھ خاک میں مل جاتی ہے پھر بھلا لڑکیاں کس شمار میں ہوں گی، مغربی عورتیں اپنے بچے کو خود دودھ پلاتی اور نہلاتی دھلاتی ہیں صرف وہ عورتیں جو افلاس اور غریبی کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ اپنے بچوں کو اجرت پر تربیت گاہوں کے سپرد کردیتی ہیں اور ہمارے نزدیک تو دودھ پلانا ہی سرے سے بڑے عار کی بات ہے۔ ہماری دولتمندی اور امیرانہ شان کے آگے اولاد کی تربیت اور اس کی نگرانی ایک ذلیل اور حقیر کام ہے چنانچہ اپنے بچوں کو ہم اناؤں، ماماؤں اور گھر کے نوکروں کے سپرد کردیتی ہیں، نوکروں اور ماماؤں کی بدذوقی، جہالت اور اخلاقی پستیاں بچوں کو بھی انھیں کا نمونہ بنا دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت اور بیگانگی محسوس کرتی ہیں۔ اگر یہ مائیں کسی دن اپنے بچوں اور ان کے کھلانے والیوں کا منظر سیرگاہوں میں یا سڑکوں کے کنارے دیکھ لیں تو یقیناً وہ ان کی بیہودگیاں دیکھ کر اپنی اولاد کی حمایت کے لئے تیار ہو جائیں گی۔

بچوں کی صحت کے متعلق بھی ہماری غفلت کا یہی حال ہے۔ مغربی عورت اپنے بچے کو خود کھلاتی ہے۔ جلدی ہضم ہو جانے والی ہلکی غذا دیتی ہے۔ سردی اور گرمی کے حملوں سے بچاؤ کی پوری پوری تدبیریں کرتی ہے۔ لیکن ہم ثقیل سے ثقیل چیزیں کھلانے لگتی ہیں۔ گوشت اور دوسری دیرہضم غذائیں کھلانے میں بڑی عجلت کرتی ہیں۔ اس سے بچے کے معدے میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دست آنے لگتے ہیں اور بسا اوقات اسی راہ سے بچہ موت تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح نظربد اور حسد کے خیال سے بچوں کو ہم صاف ستھرا نہیں رکھتیں اور میلا کچیلا ہی بنا رہنے دیتی ہیں

اور بلا موسم کی سردی گرمی کا خیال کیے آزادی کے ساتھ کھیلنے کیلئے چھوڑ دیتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ پھر علاج کے لئے ہمارے پاس سوائے تعویذ گنڈوں کے اور کیا ہے؟

اگر بچہ روتا چلاتا ہے تو ہم سمجھتی ہیں کہ بھوکا ہے۔ اس لئے رو رہا ہے، چنانچہ غذا پر غذا اس کے شکم میں ٹھونستی چلی جاتی ہیں۔ جس سے بالآخر وہ مر جاتا ہے لیکن بچے کی ماں پھر بھی ملزم نہیں۔ بلکہ وہ دوسروں پر تہمت رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ فلانی کی نظر لگ گئی۔ اب سارا گھر اس کا دشمن ہو گیا۔ اور اس کی صورت دیکھنی بھی بڑی بدشگونی سمجھی جانے لگی۔

بچہ جہاں چلنے بولنے لگا تو سب سے پہلے اس کی زبان پر ماں باپ کی گالیاں ہوتی ہیں اور حیرت تو یہ ہے کہ ہم اس پر خوش ہوتی ہیں۔ اور اس کو بچے کی خوبی سمجھتی ہیں۔ ہماری خوشی دیکھکر بچہ خیال کرتا ہے کہ وہ جو کچھ بول رہا ہے بہت اچھی اور ٹھیک بات ہے۔ پھر تو وہ خوب گالیاں بکتا ہے۔ اگر بچے میں کچھ چلنے کی قوت پیدا ہوئی تو ہم فوراً اس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک گاڑی دیدیتی ہیں۔ تاکہ چلنے میں اس کو امداد پہنچے۔ لیکن یہ ہماری بڑی نادانی ہے۔ بچے کی ہڈیاں بالکل نرم ہوتی ہیں۔ چلنے کی پوری قوت پیدا ہونے سے قبل جب وہ بار بار کھڑا ہونے اور چلنے کی محنت کرتا ہے تو ہڈیاں جھک جاتی ہیں۔ اور پنڈلیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ اور وہ بڑا ہو کر عجیب الخلقت بنجاتا ہے کہیں ریڑھ کی ہڈی میں خم پیدا ہو جاتا ہے کہیں چھاتی کا حصہ باہر نکل آتا ہے۔ اسی طرح بچے کی چارپائی اور سونے کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھتیں اور ہمکو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ روشنی کی شعاع کا بچے کی آنکھوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے اس کی وجہ سے ہماری اولاد میں بہت سے بچے اندھے، اینچے اور ترچھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے میلے کچیلے پیلے رنگ کے بچوں میں اور مغرب کے صحیح الجسم اور صاف ستھرے بچوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ مغربی بچے کی یہ کتنی اچھی عادت ہے کہ وہ صبح شام اپنے والدین کے ہاتھ چومنے جاتا ہے

کسی کا ذرا سا بھی قصور ہو گیا تو اس سے معافی چاہتا ہے، اگر کسی نے کچھ کام کر دیا تو اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اگر باپ نے لڑکے کی کسی غلطی پر کسی دن اس کو ہاتھ چومنے سے محروم رکھا تو وہ روتا گڑگڑاتا ہے۔ اور بالآخر والد سے اپنا قصور معاف کرا لیتا ہے۔ اس قسم کی عادتیں سکھا کر مغربی خاتون گویا اپنی اولاد کو بچپن ہی سے یہ تعلیم دیتی ہے کہ والدین کی رضامندی ان کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔

ہماری طرح مغربی خاتون اپنے بچوں کو مار پیٹ کر مردہ دل اور بزدل نہیں بنا دیتی۔ اور لڑکوں کو مارنے پیٹنے کے معنی کیا؟ مقصد تو صرف اتنا ہے کہ جن باتوں کو ہم ناپسند کریں بچہ وہ نہ کرے، تو کیا یہ مقصد بلا گالی گلوچ اور زدوکوب کئے دوسرے تادیبی طریقوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ گالیاں سننے اور مار کھانے سے بچوں کے اندر پست ہمتی اور اپنی حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جو آگے چل کر ان کو انتہا درجے کا ضدی اور خودسر انسان بنا دیتے ہیں۔

جس قدر ہم اپنے بچوں کو فضول بکواس اور چیزوں کو خراب و برباد کرنے کی آزادی دیتی ہیں۔ اسی قدر ان کو مفید کھیلوں سے منع کرتی ہیں۔ چنانچہ ہم اس کو دوڑنے سے منع کرتی ہیں۔ قدرت کے خوبصورت مناظر سے اکثر محروم رکھتی ہیں۔ حالانکہ مغربی لڑکا اپنے گھر ماں باپ کی طرح ایک اہم فرد سمجھا جاتا ہے۔ وہ سبھوں کے ساتھ دور دراز ممالک میں تبدیل آب و ہوا کے لئے جاتا ہے۔ اس کے تمام اسباب اور کھلونے مستقل طور پر علیحدہ ہوتے ہیں، لڑکپن ہی سے اس میں ایک استقلالی حیثیت اور کیفیت پیدا ہوتی ہے، بولتے وقت جہاں کہیں غلطی ہوئی ماں نے وہیں ٹوکا۔ اور اس کے سامنے صحیح بول کر درست کر دیا۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ بچوں کو خوش کرنے اور ان سے بولنے کے لئے انھیں کی زبان میں تتلا کر باتیں کرتی ہیں۔ اور اپنی فصیح زبان تو کیا عام بازاری زبان بھی نہیں سکھاتیں۔

بچّے ابھی چھوٹے ہی رہتے ہیں کہ ہم کو مدرسہ میں داخل کرانے کی جلدی پڑ جاتی ہے۔ ان کو نہ علم سمجھنے کی قوت اور نہ سنجیدہ بنکر بیٹھے رہنے کی عادت، اگر ہم ان کو مدرسہ میں بھیجدیتی ہیں۔ وہاں مدرسین ان کو غیر دلچسپ اور اکتا دینے والی تعلیم سے تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر ستم یہ کہ ان کے متحرک اور چلبلے اعضا پر یہ سخت پابندی کہ اپنی جگہ پر سکون کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ یہی باتیں بچّے کے دل میں مدرسہ کی طرف سے نفرت پیدا کرتی ہیں

اور جب ماں مدرسہ جانے پر زیادہ مجبور کرتی ہے تو یہ جبر اس کی نفرت میں اور اضافہ کرتا ہے۔ بہت سے بچّوں کی علمی استعدادیں اس لئے برباد ہوئی ہوں گی کہ ہم نے ان کو بہت چھوٹی عمر میں مدرسے بھیجا۔ اور پھر مدرسین نے اپنے پرانے طریق تعلیم سے تنگ کرکے ان کی طبیعتوں کو تعلیم سے اچاٹ کردیا۔ مغربی لڑکا ہمارے لڑکوں سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہے پہلے تو گھر میں اس کی ماں ہی بذریعہ مشاہدہ تعلیم دینا شروع کرتی ہے۔ وہ بچّے کو نزدیک کی چیزیں دکھا دکھا کر اس کے آسان اور مختصر فوائد بتاتی ہے تاکہ خوب اچھی طرح ذہن میں اتر جائیں، وہ بچّے کو احسان کرنا اور محبت کرنا سکھاتی ہے اور خود انکے سامنے مختلف طریقوں سے احسان اور محبت کرکے بتاتی ہے۔ اسی طرح وہ نہایت دلچسپ طریقہ سے ابتدائی لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیتی ہے۔ اور اس وقت تک مدرسے نہیں بھیجتی جب تک خود بچّے کو اس کا شوق نہ ہو۔ اور اس میں آئندہ ملنے والی تعلیم کی استعداد پیدا نہ ہو جائے چھوٹے بچّوں کو مدرسے بھیجنے کے نقصانات کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں تقریباً تین سال تک مدرسہ جاکر بھی نہیں سمجھتی رہی کہ مدرسہ ہے کیا؟ اور مجھے یہاں روزانہ کیوں بھیجا جاتا ہے؟ میں نے مدرسہ کی لڑکیوں میں انھیں لڑکیوں کو تعلیم میں ممتاز دیکھا۔ جو آٹھ دس سال کی ہوکر مدرسے میں آئیں۔ چھوٹی لڑکیوں کو تو زیادہ تر مدارس سے یہی فائدہ ہوا کہ ان کی صحت ابتر اور ان کا جسم کمزور ہوگیا۔ اور جو کچھ ان کی تعلیم پر خرچ کیا گیا وہ مزید براں،

ہمارے ہاں تربیت کے دو ہی طریقے ہیں۔ اور دونوں مضر ہیں۔ ایک تو سختی کا اور دوسرا لاڈ کا۔ سختی کرنے سے بچوں میں دنائت اور پستی پیدا ہوتی ہے۔ اور لاڈ بچوں کو مغرور اور سرکش بنا دیتا ہے۔ ہماری سختی کا نقشہ تو یہ ہے کہ ہم بچوں کو ڈراتی دھمکاتی ہیں۔ ان کے دماغوں میں اندھیری اور اس کی ڈراؤنی صورتوں کا خوف غالب کرتی ہیں اور بے بنیاد چیزوں کے نام سے ان کو مرعوب کرتی ہیں۔ اور ضد کرنے پہ مارتی پیٹتی ہیں اور ہمارے لاڈ اور پیار کا یہ عالم ہے کہ ہم نیچے میں انانیت پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ جس چیز کے لئے رونے لگتا ہے اسی وقت لا حاضر کرتی ہیں۔ حالانکہ رونے سے قبل انکار کر چکی ہوتی ہیں اس سے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ رونے سے تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ پھر تو وہ ہر ایسی بات پر جس سے اس کو روکا جائے رونے لگتا ہے۔ اور یہ تو میں نے بکثرت دیکھا ہے کہ ایک لڑکا اپنے چھوٹے بھائی یا بہن کو رونے کی تعلیم دیتا ہے۔ تاکہ جو کچھ چاہتا ہے جلد حاصل ہو جائے۔

یورپ والے ایسا نہیں کرتے۔ ان کا طریقہ بچوں کی تربیت میں ہم سے کہیں اچھا ہے۔ وہ رو رو کر کوئی چیز مانگنے والے بچے کو یہ سزا دیتے ہیں کہ وہ چیز اس کو ہرگز نہیں دیتے۔ جس سے اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ رونے سے کچھ فائدہ نہیں پھر تو وہ مناسب طریقوں سے طلب کرتا ہے۔ اور اگر منع کر دیا جائے تو دوبارہ طلب بھی نہیں کرتا۔

جوانی سے پہلے

یہ وہ دور ہے جب لڑکی کے عادات و اطوار اچھے ہوں یا برے صاف کھل جاتے ہیں۔ اگر برے ہیں تو اس کا بدلنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اس دور میں بہو بیچکر لوگ لڑکوں کے مدرسے کی حاضری کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا کچھ

اہتمام نہیں کرتے۔ ہاں کچھ دنوں سے یورپ کی تقلید میں لوگ لڑکیوں کو تعلیم دینے لگے ہیں لیکن نہ یہ تقلید ہی مکمل ہے اور نہ اس سے نفع کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ یورپ کی لڑکی مدرسہ جاتی ہے تو اپنی تعلیم کا سلسلہ اس وقت توڑتی ہے جب وہ اعلیٰ درجے تک پہونچ چکی ہوتی ہے۔ یا کوئی خاص سند حاصل کر لیتی ہے۔ اور ہماری لڑکیاں ابھی اچھی طرح لکھنے پڑھنے پر قادر بھی نہیں ہوتیں کہ تعلیم اور مطالعہ دونوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو لیتی ہیں اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم تعلیم جیسی نفع بخش چیز کے لئے مغرب کی تقلید نہیں کرتیں، بلکہ وہی ظاہری نمائش اور زیب و زینت کی خاطر اور ناچ گانے اور پیانو بجانے کے لئے یورپ کی تقلید کرتی ہیں۔

اس عمر میں ہماری لڑکیاں کن کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں؟ عشقیہ ناولوں اور افسانوں کا اور چونکہ ان کا یہ وقت ہر قسم کے نفسی تاثرات کے قبول کر لینے کا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عشق و آشنائی کے واقعات و حوادث سے پوری طرح متاثر ہو جاتی ہیں، ناول اور افسانے پڑھکر ان کے دلوں میں ہر وقت حسن و عشق کے حالات اور مواقع متحرک تصاویر کی طرح ان کی نظروں کے سامنے تازہ ہوتے اور پھرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی نرم عقلوں پر بعض واقعات کا گہرا اثر پڑ جاتا ہے۔ بلاشبہ اس معاملے میں بڑی حد تک باپ کا قصور ہے۔ وہ کیوں اپنی لڑکی کے لئے عمدہ اخلاقی کتابیں نہیں لا دیتا جن میں تربیت اور ازدواجی زندگی پر بہترین اصلاحی مضامین لکھے گئے ہوں۔ وہ کیوں نہیں مشہور با کمال مردوں اور خواتین کے تذکرے اور تاریخ کی کتابیں مہیا کرتا؟ جن کو پڑھکر اس کے دل میں بڑوں اور بزرگوں کی سی زندگی بنانے کا شوق پیدا ہو۔ یہ تو لڑکیوں کی تعلیمی حالت ہے۔ اب رہی ان کی آزادی تو ہماری بہت سے تعلیمیافتہ لڑکیاں سمجھ رہی ہیں کہ اب وہ اس منزل پر جا پہونچیں۔ جہاں عورت کو یورپین لیڈی کی طرح آزادی ملجانی چاہیے۔ اور اب وہ اس کی حقدار ہو گئیں کہ بلا کسی محرم و محافظ

کے جہاں چاہیں جائیں۔ آئیں، دور دراز مقامات کا تنہا سفر کریں۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک غلط رائے ہے۔ یورپ اس آزادیٔ نسواں کے ہاتھوں اپنی لڑکیوں کو غم والم کے اتنے حوادث میں مبتلا کر چکا ہے کہ ساری دنیا ان کی پست اور ننگ اخلاق زندگی سے بیزار ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس عمر میں لڑکیوں کو نوجوانوں کے میل جول سے باز رکھنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے لڑکیوں کی شرافت پر بھروسہ نہیں ہے۔ بلکہ اس خیال کے اظہار سے میں ایک فطری خطرے کی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہوں۔ اور عقلمند وہی ہے۔ جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرلے۔ اس عمر میں اگر ہم احتیاط اور نگرانی سے کام نہ لیں تو سب سے پہلے خود ہمارے رشتہ دار ہی ہمیں ملامت کریں گے، یہ بالکل صحیح ہے کہ اس عمر میں لڑکیاں آزادی چاہتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ ورزش کے طور پر گھر سے باہر نکلیں اور سیر و تفریح کریں۔ میں ان کو اس سے منع کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں مگر میں ان کے والدین کو نصیحت کروں گی کہ وہ اس قسم کے مواقع پر ساتھ ہوں۔ اور ان کی رفاقت اور نگرانی کرتے رہیں۔ اس کے بعد اگر ان کو لڑکی کی حسن سیرت اور قوت ارادی پر پختہ اعتماد ہو جائے تو اس کی سہیلیوں کے ہاں جانے آنے کی اجازت بھی دیدیں۔ میری نظر میں انتہائی آزادی اور انتہائی نگرانی دونوں مضر ہیں۔ نہ یہ اچھا ہے کہ لڑکی کو بالکل خود مختار اور مطلق العنان بنا دیا جائے۔ اور نہ یہ بہتر ہے کہ شدت کی پابندی اور نگرانی میں مقید رکھا جائے۔ اس لئے کہ جس طرح آزادی خرابیوں اور برائیوں کے راستے ہموار کر دیتی ہے۔ اسی طرح سخت پابندی لڑکی کو ہر چیز کا شائق بنا دیتی ہے۔ اور وہ بہت جلد مکاری اور فریب کاری کے سبق سیکھ لیتی ہے۔ ایسی لڑکی کے والدین حقیقت میں دو جرم کے مجرم ہیں۔

لڑکیوں کی خوبی اور لیاقت کا دار و مدار ہمیشہ پہلی تربیت پر ہوتا ہے۔ اگر ابتدا میں

اُن کی تربیت اچھی نہیں ہوئی ہے تو قید و بند اور سخت نگرانی سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ ان کو تھوڑی بہت آزادی دیدی جائے۔ اس لئے کہ عادت تو چھوٹ سکتی نہیں اب اگر بہت زیادہ سختی کی گئی تو وہ چوری اور فریب سے کام لیں گی۔ لڑکیوں نہ ہم ان کو فریب کاری اور چوری کی برائیوں سے محفوظ رکھیں۔

لڑکیوں کی تربیت کا سب سے اچھا طریقہ میری نظر میں یہ ہے کہ ان کو بلوغ سے قبل ہر مناسب چیز دکھادی جائے۔ یعنی باپ کو چاہیے کہ دس سال کی ہونے سے پہلے ہی وہ لڑکی کو مختلف قسم کے کھیل تماشے شہر کی بڑی بڑی دوکانیں، کمپنیاں عام شاہراہیں، تفریح گاہیں اور آثار قدیمہ کی چیزیں دکھادے۔ اور سیر کرادے اس کو جلسوں میں لیجائے، موٹروں پر سوار کرے۔ الغرض اپنے امکان بھر ہر اچھی اور عجیب چیز اس کو اپنے ساتھ لیجاکر دکھادے۔ تاکہ اس کے دل و دماغ میں ایک روشنی پیدا ہو جائے۔ اور وہ ہماری دوسری سادہ لوح لڑکیوں کی طرح بے خبر نہ رہے اب اگر آئندہ زندگی میں اس کے لئے اس قسم کی سیر و تفریح کے مزید مواقع آئیں۔ تو مستفید ہو۔ اور اگر نہ آئیں تو مایوس اور حسرت زدہ نہ رہ سکے۔

مدارس ۔ مجھے بعض مدارس کا یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ لڑکیوں کو لانے اور پہنچانے کا انتظام اپنی خاص گاڑیوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس انتظام سے ایک تو گھر کے لوگ راستے کے حوادث سے بے خوف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے نوکروں کی نگرانی کے خدشات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو بسا اوقات خرابیوں کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں اور ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ لڑکیوں کو مدارس تک پہنچانے والے اور پھر چھٹی کے بعد گھر تک واپس لانیوالے ملازم کا بہت سا وقت بچتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہمارا محکمہ تعلیمات بھی اس قسم کی گاڑیاں خرید لیتا یا کرایہ پر حاصل کر لیتا۔

تعلیم نسواں کے بعض مخالفوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کا جاہل اور بے پڑھی

لکھی رہنا ہی بہتر ہے، اس لئے کہ تعلیم پاکر وہ علم کے ذریعہ میل جول کا دائرہ بہت وسیع کریں گی۔ اور یہ بات ہماری عادت کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر تربیت اچھی ہو چکی ہے تو اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں نکل سکیگی ایک تربیت یافتہ شریف لڑکی کے لئے اس کی عزت، اس کے خاندان کا وقار اور خود اس کی نیک عادتیں بہترین رہنما ہیں۔ جو اس کو یقیناً برائیوں سے روکیں گی۔ تعلیم یافتہ لڑکی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی آبرو کی مثال ایک صاف شیشے کی سی ہے۔ جس کو ذرا سا غبار آلودہ کرسکتا ہے۔ اور اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر جوڑا نہیں جا سکتا۔ اور اگر ابتدا ہی میں لڑکی کی تربیت میں خامیاں رہ گئی ہیں اور وہ خراب عادتوں کا شکار ہو چکی ہے تو پھر برائیوں کی طرف تیزی کے ساتھ قدم بڑھائے گی۔ خواہ پڑھی لکھی ہو۔ خواہ جاہل۔

لباس مشرقی لباس میں بڑی آسانی، سہولت اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اور پھر وہ ہمارے ملک کی سردی گرمی کے موسموں کے مطابق بھی ہے۔ اس کے برخلاف مغربی لباس کی ساخت پیچیدہ، پہننے میں دشواری اور اتارنے میں بڑا تکلف ہوتا ہے۔ یورپین لیڈیوں کا لباس جگہ جگہ سے الگ کئی حصے ہوتا ہے۔ اور اس طرح پہنا جاتا ہے کہ کمر بندھی ہوئی۔ شکم دبا ہوا اور گردن اٹھی ہوئی رہتی ہے جس سے جلد کے طبعی تنفس پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اور پھر گردن کا پچھلا اور اگلا حصہ بالکل برہنہ سردی گرمی کے حملوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر غرض کے لئے ایک لباس الگ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک صبح کے لئے، دوسرا شام کے لئے، تیسرا گھر سے باہر نکلنے کے لئے، چوتھا رقص کے لئے۔ اور علیٰ ہٰذالقیاس مختلف کاموں کے لئے مختلف لباس ہوتے ہیں۔ یورپ کی خواتین اپنے لباس کی تبدیلی اور پہننے اتارنے میں جو طویل وقت صرف کرتی ہیں، اگر وہ کسی مفید کام پر صرف کریں تو نہ صرف قوم کو فائدہ پہنچائیں

بلکہ خود بھی بہت سی منتوں سے آرام پا جاتی ہیں۔

لباس اور زینت کے متعلق میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ جو لڑکیاں بہت زیادہ بنتی، سنورتی رہتی ہیں اور اپنے لباس کی زینت و آرائش میں مبالغہ سے کام لیتی ہیں تاکہ لوگوں پر ان کی دولتمندی اور خوبیوں کا اثر پڑے وہ اپنے مقصد میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ یعنی ان کی شادیاں بڑے لیت و لعل اور بہت تاخیر کے بعد ہوتی ہیں اور شوہر بھی خدا کے فضل سے ایسے ملتے ہیں جن کی حالت و ہیئت امید کے خلاف ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ قدرت کی طرف سے ایک سزا ہے جو ہر دم بناؤ سنگھار سے زرق برق رہنے والی لڑکیوں کو دیجاتی ہے۔ کوئی مرد کسی شوخ اور غیر شریف عورت کو خواہ کیسی ہی خوبصورت اور شیریں کلام ہو اپنی بیوی بنانا جلدی پسند نہیں کریگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس چیز نے اس کو مائل کیا ہے وہی دوسروں کو بھی متوجہ کر چکی ہوگی۔ کریگی اور کرتی رہے گی۔ اگر لڑکیوں کو معلوم ہو جائے کہ مرد اپنی بیوی بنانے کیلئے عورت میں سب سے پہلی بات یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کس قدر سنجیدہ سادہ اور باوقار ہے تو اسی وقت اپنی غلط فہمی چھوڑ کر ظاہری زینت و نمائش سے باز آجائینگی۔ جس کو انھوں نے اس لئے اختیار کیا تھا کہ مردوں سے قریب ہوں حالانکہ حقیقت میں اسی وجہ سے وہ مردوں کے دل سے دور ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں عورتوں کو خشک سادگی اور زینت و سنگھار ترک کر دینے کی دعوت دیتی ہوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ خدا نے جو چیز حلال کر دی ہے میں اس کو حرام کر دوں۔ اور پھر عورت کے بناؤ سنگھار میں بڑی حد تک خود اس کی اور اس کے شوہر کی سعادت اور مسرت کا راز پوشیدہ، میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنی زینت اعتدال اور حد کے اندر رکھی جائے۔ ایسا بناؤ سنگھار نہ کیا جائے جو حد سے بڑھکر عورت کو غیر شریف اور شوخ بنا دے۔

منگنی اور شادی کا دور

نوجوان لڑکیاں اس دور کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اس کی مصیبتوں اور زحمتوں سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے جلدی آجانیکا انتظار نہ کرتیں میں سمجھتی ہوں کہ ان کے انتظار و اشتیاق کی وجہ ان نئے نئے زیوروں اور خوشی کی رسموں کا خیال ہے۔ جو شادی کے موقع پر ادا کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتیں کہ شادی ہو جانے کے بعد ان پر کتنی زبردست ذمّہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ان کی یہ نئی زندگی اپنے اندر کس قدر نفسی تکالیف پنہاں کئے ہوئے ہے۔ ذرا غور تو کیجئے ایک وہ لڑکی ہے جو نیند بھر آرام سے سوتی ہے، اپنی جان کے علاوہ کسی کی ذمّہ داری اس کے سر نہیں۔ اس کے والدین اور رشتہ دار ہر دم اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ پہننے کے لئے جیسے کپڑے اور کھانے کے لئے جو چیزیں چاہتی ہے، لا دیتے ہیں۔ اور اسی کے بالمقابل ایک شادی شدہ لڑکی ہے جو آدھی رات تک تو غریب اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اور پھر صبح آفتاب نکلنے سے قبل ہی اس کو اٹھنا پڑتا ہے۔ تاکہ ناشتے اور شوہر کی بعض ضروریات کا انتظام کرے۔ اس کے بعد وہ سارا دن گھر کے کاموں میں یا نوکروں کی نگرانی میں صرف کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کو اور تمام گھر والوں کو راضی رکھے۔ اولاد کی تربیت کرے اس قدر زیادہ کاموں اور مختلف قسم کی ذمہ داریوں کے بعد اس سے ناز پرس بھی بڑی کڑی کی جاتی ہے، ادنیٰ سا قصور سرزد ہوا اور وہ ٹوکی گئی حقیر سی لغزش ہوئی اور وہ پوچھی گئی۔ ان تمام تکالیف کے بعد اگر بدقسمتی سے شوہر کوئی شرابی ملا۔ یا کسی احمق اور بیوقوف سے پالا پڑ گیا، یا اس سے بھی بڑھکر یہ کہ سوت کا عذاب نازل ہو گیا

تو بس رہی سہی خوش بختی اور خوبصورتی کا جنازہ ہی گھر سے نکل جاتا ہے۔

شادی کا ذریعہ ہمارے یہاں محض زبانی پیام ہے۔ رشتہ دار، پڑوسی، اور پیام لانیوالے جو کچھ کہدیں اسی پر شادی کی بنیاد رکھدی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ ہر شخص کا ذوق اور ہر شخص کی طبیعت جدا ہوتی ہے، بہت ممکن ہے کہ ایک بات ایک شخص کی نظر میں خوبی ہو اور دوسرے کو اس سے اتفاق نہ ہو۔ اس بنا پر اکثر ایسی شادیاں ہوجاتی ہیں۔ جن میں شوہر پیام لانیوالوں کی زبانی بیان کردہ اوصاف کے مطابق اپنی بیوی کا ذہن میں ایک تخیل قائم کرتا ہے۔ جو بعد میں بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پیام لانیوالوں نے تعبیر غلط کی تھی یا اپنے اغراض کی خاطر خلاف واقعہ بیانات دیئے تھے، اسی طرح لڑکی کو بھی اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ہونیوالے شوہر کا نام یہ ہے اور اس کے پاس دولت اتنی ہے۔ اور دولت بھی بہت کچھ بڑھا چڑھا کر بتائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اور اس کے رشتہ دار جلد رضا مند ہوجائیں۔

اس قسم کے دولھا دلہن جب پہلی بار اکٹھا ہوتے ہیں تو فرط حیرت سے تقریباً گونگے ہوجاتے ہیں، ان پر خلاف توقع نقشہ دیکھ کر غشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ پھر جب کچھ دن گذر جاتے ہیں تو کھینچ تان کر جبراً وقہراً دونوں یا تو متحد ہوجاتے ہیں، یا پھر آخر تک دونوں کی دنیا الگ ہی رہتی ہے، کیا یہ تمام خطرات حقیقت میں ہمارے اس عقیدے کے نتائج نہیں ہیں جو تقدیر کے متعلق غلط طور پر ہم نے رکھ لیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تقدیر کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ لیکن یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ تقدیر کو اپنی غفلت اور بے پروائی کا بہانہ بنالیا جائے۔ شادی کا معاملہ ایک اختیاری بات ہے، اس میں عقل کو پورے اختیارات حاصل ہیں اگر اس نے اپنے اختیار کا مناسب استعمال کیا تو انجام بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ آخر میں پریشانیاں

اور خرابیاں لاحق ہوتی ہیں۔ عام طور پر عورتوں کو اپنا چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت دینے میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ضرور ہے۔ لیکن منگنی کے خاص موقع پر تو تمام ائمہ متفقہ طور پر اس کی اجازت دیتے ہیں۔ تاکہ بعد میں فریب کاری اور دغا کا الزام کوئی کسی پر عائد نہ کر سکے،

منگنی کے اس کورانہ طریقے کی وجہ سے مشرق جن مصائب میں گرفتار ہے، ان سے بچنے کیلئے مغرب نے یہ ضروری قرار دیا کہ شادی سے قبل عورت مرد متعدد بار ایک دوسرے سے ملاقاتیں کریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشرق کی طرح مغرب نے بھی پوری افراط سے کام لیا، اس نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ شادی سے قبل متعدد بار ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں۔ بلکہ وہ ایک منزل آگے بڑھا اور یہ شرط لگادی کہ جب تک عورت مرد میں باہمی رضامندی اور محبت کا تبادلہ نہ ہولے، شادی نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کے ماتحت یورپ اپنی لڑکیوں کو مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ عام تفریح گاہوں، رقص خانوں اور مردوں کے اجتماع میں بکثرت آمد ورفت رکھے۔ تاکہ بخت واتفاق سے اپنا کوئی شریک زندگی حاصل کرلے۔ لیبا اوقات اس قسم کی متعدد ملاقاتیں بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں اور دونوں کو از سرنو دوسروں کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح بڑی جدوجہد اور انتہائی کاوشں کے بعد جب کوئی نوجوان ملجاتا ہے اور شادی کے لئے اپنے ارادے ظاہر کرتا ہے تو لڑکی سمجھتی ہے کہ مراد حاصل ہوگئی۔ اب وہ اپنے گھر والوں کو مطلع کرتی ہے، اس کے بعد وہ نوجوان اس کی ملاقات کے لئے اس کے گھر بھی آنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اکثر مہینوں اور بعض صورتوں میں برسوں جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد یکایک نوجوان اپنے ارادے سے باز آجاتا ہے۔ اور اعلان کر دیتا ہے کہ دونوں کے دل ایک دوسرے سے مانوس نہیں ہو سکے۔ اور اس لئے یہ آزمائش ناکام رہی۔

شادی سے قبل عورت مرد کی ملاقات کا خیال اگر اس مصلحت پر ہے اس سے

دونوں کی اخلاقی اور جسمانی صحت کے متعلق پورا وثوق ہو جائے تو یہ ایک بہتر اور معقول خیال ہے۔ لیکن غفلت اور تساہل کی یہ حد کہ انگشتری پہنا دینے کے بعد بھی جو درحقیقت رضامندی کا آخری اعلان ہے۔ انکار کر دینا نہایت معیوب اور مذموم بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا پیچیدہ اجتماعی مسئلہ ہے۔ میری نظر میں نہ اس قدر طویل آزمائشی اختلاط اچھے نتیجے پیدا کر سکتا ہے۔ اور نہ شدید پردہ۔ بلکہ ایسے اختلاط اور پردے سے تو لڑکی اپنی عمر کا مناسب حصّہ بلا شادی کے گذارنے پر مجبور ہوتی رہے گی۔ یہ گتھی اس طرح سلجھ سکتی ہے کہ ہم اپنے عرب اسلاف کے وہ طریقے اختیار کریں جو اسلام کے اوائل عہد میں رائج تھے۔ یعنے ضیافت اور مہمانداری کے مواقع پیدا کریں، اپنی متعلقہ ضروریات کی تکمیل کے سلسلہ میں دیہاتوں میں آمد و رفت رکھیں اسی قسم کی تقریبات سے فائدہ اٹھائیں۔ آج بھی یہ طریقہ دیہاتوں میں رائج ہے کاش کہ شہر کے لوگ بھی اسی کی اتباع کرتے۔ بشرطیکہ فتنہ اور آبرو ریزی کا خطرہ نہ ہو۔ ورنہ پردہ ہی عورت کے لئے ایک محفوظ قلعہ ہے۔ بہرحال عورت کو مرد کے ساتھ تنہائی کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ خلاف شریعت بھی ہے اور بہت سی تہمت تراشیوں کا سبب بھی۔

یہ تو ہوا منگنی کے متعلق اب رہا شادی کا معاملہ تو اس کا طریقہ بھی معقول نہیں، یورپ کے بعض ممالک میں خود عورت کی طرف سے مہر ادا کی جاتی ہے، یہ رسم عورت کو گھر کا خود مختار اور مالک بنا دیتی ہے۔ آج سے قبل مشرق میں اگرچہ عورت کچھ نہیں دیتی تھی۔ لیکن مرد کی طرف سے مہر میں جو کچھ ملتا وہ لڑکی والے اپنی ذات پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ اس سے نہ لڑکی کے لئے کوئی چیز خریدتے اور نہ اس میں سے لڑکی کو کچھ حصّہ دیتے تھے۔ اس رسم کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پورے گھر کا مالک و مختار مرد تھا۔ اور عورت کو اس کے مقابلے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ دونوں طریقے بلا الٰہی کی

معقولیت پر غور کئے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دئے صاف صاف بتاتے ہیں کہ طرفین میں جو مہر ادا کرے وہی گھر کا مختار بنا رہے۔

ہمارا موجودہ طریقہ بھی ٹھیک نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے گھر کی مختاری کا قضیہ باقی رہتا ہے۔ مرد تو مہر ادا کرتا ہے۔ لیکن عورت اپنے گھر سے اپنے ساتھ مہر سے دوچند بلکہ اس سے بھی زیادہ لاتی ہے۔ اور جو کہیں عورت دولتمند ہے اور اس کی دولت دیکھ کر ہی شادی کی گئی ہے، تب تو گھر کی مختاری کا جھگڑا یقینی ہے۔ عورت اپنی دولت اور مال کی وجہ سے افسری کی طلبگار ہوگی اور مرد اس لئے گھر کی سرداری چاہیگا کہ خدا نے اس کو شوہر بنایا ہے۔

مگر کیوں ہم یہ گراں باری اپنے سر لیں۔ گھر شوہر کے نام سے ہے عورت کے نام سے نہیں۔ اگر شوہر کو یہ پسند ہے کہ اس کے گھر میں چٹائی کا فرش رہے تو یونہی سہی اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے درودیوار اور سقف وستون پر سونے کا ملمع کرلے تو نہایت شوق سے، اگر اس کی خواہش ہے کہ اس کا گھر ایک ویران خانہ بنا رہے تو چشم ما روشن دل ما شاد، مگر اس کے ساتھ ہی شوہر اور اس کے رشتہ داروں کو بھی عورت کی طرف سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ عورت کا مال واسباب خود اسی کیلئے ہے

طلاق کے حوادث خود ہمارے لئے ایک زبردست نصیحت ہیں۔ اگر ہم ان پر غور وفکر کی نظر ڈالیں۔ میاں بیوی اکثر جائداد واسباب کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں اور ہر ایک دعویٰ کرتا ہے کہ اصلی حقدار وہی ہے۔ اگر کسی مطلقہ کا شوہر رحیم الطبع ہے۔ اور اس نے اس کے لئے کچھ چھوڑ دیا ہے تو اب یہ عورت اپنے گھر والوں کے پاس لاکر سب کچھ جمع کردیتی ہے۔ اور جب دوسری مرتبہ نکاح کرنیکا موقع آتا ہے تو پھر از سر نو تمام اسباب بڑی مصیبت کے ساتھ جمع کرنے پڑتے ہیں۔

جہیز کی فضول خرچیوں کے متعلق اگر میں دولتمند خواتین کو ایک بار ملامت

کروں گی تو غریبوں کو بار بار کروں گی۔ کتنی جائدادیں اور مکان محض جہیز کی خاطر برباد اور فروخت ہو گئے یا رہن رکھدیئے گئے۔ اور پھر اپنا سرمایہ برباد کر کے جہیز میں جو اسباب دیئے جاتے ہیں تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ پرانے اور فرسودہ ہو جاتے ہیں اور شوہر کو ان کی جگہ نئے اسباب کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے ایک شخص کی حکایت یاد ہے جس کے پاس سو بیگھہ نہایت زرخیز زمین تھی۔ اور اسی کی پیداوار پر وہ خوشحال زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تینوں لڑکیوں کے جہیز میں اپنی روزی اس طرح کھوئی کہ پہلی لڑکی کے جہیز کا سامان تیس بیگھہ فروخت کر کے جمع کیا۔ دوسری کی شادی میں تیس بیگھہ زمین رہن رکھدیا۔ اور تیسری کے جہیز میں بقیہ زمین رہن رکھدی، میعاد پوری ہونے پر رقم ادا نہ کر سکا۔ اور اس کی ساری زمین قرض خواہوں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ یہی نہیں بلکہ رہنے کا مکان بھی ضبط ہو گیا۔ اس شخص کو کون عقلمند کہہ سکتا ہے، ساتھ ہی یہ لڑکیوں کی سنگدلی ہے کہ وہ اپنے باپ کا گھر اجاڑ کر اپنے شوہر کا گھر آباد کریں۔ جہیز کے معاملہ میں کیوں عورتیں اپنے سے زیادہ دولتمند خواتین کا مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔ کیا وہ غریبی کو عیب سمجھتی ہیں۔

مغربی عورتیں ہماری طرح اپنی دولت برباد نہیں کرتیں۔ اور نہ ایسے کاموں میں لگاتی ہیں۔ کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ختم ہو جائے۔ بلکہ وہ اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگاتی ہیں۔ اور ضرورت کے مواقع کے لئے محفوظ رکھتی ہیں۔ یا اپنی اولاد کی خاطر جمع رکھتی ہیں۔ یا رفاہ عام کی انجمنوں کے سپرد کر دیتی ہیں جس سے فلاکت زدہ اور غریبوں کی زندگی سدھاری جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی خواتین مالی معاملات میں ہم سے کئی منزل آگے ہیں۔

امور خانہ داری اور کفایت شعاری یورپ کی عورتیں اپنے سرمایہ کے بڑھانے اور ترقی دینے کے علاوہ اپنے گھر کے مصارف اور آمدنی کے حساب سے ایک

بجٹ مقرر کرتی ہیں۔ اس بجٹ سے زیادہ کبھی وہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتیں اور نہ کوئی چیز بے ضرورت اور بے محل خریدتی ہیں۔ علاوہ ازیں جو کچھ خریدتی ہیں پوری جانچ اور تلاش کے بعد تاکہ چیزوں کی عمدگی پر پورا اطمینان ہو۔ اور قیمت بھی واجبی ادا کی جائے۔ یورپین عورتیں پھٹے ہوئے کپڑوں کے رفو اور پیوند لگانے میں اعلیٰ مہارت رکھتی ہیں۔ وہ ہر پرانے کپڑے کو درست کرکے بالکل نیا بنا دیتی ہیں، ایک ہی کپڑے کو متعدد صورتوں سے کانٹ چھانٹ کرکے بالکل نئی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ہماری خواتین ایسے مواقع پر سخاوت اور فیاضی سے کام لیتی ہیں لیکن ہماری فیاضی بھی غیر مفید ثابت ہوتی ہے۔ کسی قیمتی ریشمی چادر پر ایک ذرا سا سوراخ پڑ گیا۔ اس کے بعد ہماری غفلتوں سے پوری چادر ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔ اب ہم فیاضی دکھاتی ہیں اور وہ چادر کسی خادمہ یا فقیر عورت کے حوالے کر دیتی ہیں۔ لیکن اس ریشمی چادر کے بجائے اگر ہم ان کو کسی موٹے سوتی کپڑے کا ٹکڑہ بخشتیں توان کے لئے اس ریشمی چادر سے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اور اگر ہم اس اعلیٰ قسم کی ریشمی چادر کو رفو یا پیوند سے درست کر لیتیں تو یہ ہمارے لیئے مفید ہوتا۔

مغربی تربیت کی بنیاد نگرانی اور توجہ پر ہے۔ اور ہم نہ تو توجہ سے کام لیتی ہیں اور نہ نگرانی رکھتی ہیں۔ مغربی خواتین اپنی ہنرمندی اور محنت سے اپنی دولت کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ اپنا اور تمام گھر والوں کا لباس سی لیتی ہیں اور سب کے کپڑوں پر استری بھی کر لیتی ہیں۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ بھی دھوبیوں سے استری کراتے ہیں۔ اور معمولی سے معمولی کپڑا بھی درزی سے ہی سلواتے ہیں۔

مغربی عورت اور مرد دونوں اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ لوگوں کو کس طرح اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ معمولی اور متوسط درجے کی ایک

چیز کو اس خوبی کے ساتھ سجاتے ہیں کہ وہ بڑی خوبصورت بنجاتی ہے اور نگاہیں اس طرف اُٹھ ہی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ یورپین تاجروں کی دوکانوں میں ایسی بہت سی چیزیں موجود رہتی ہیں جو مضبوطی میں ہماری مشرقی چیزوں سے بدرجہا کم اور پست ہوتی ہیں لیکن نہایت خوبصورت طریقے پر سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ ایک بڑی وسیع دوکان ہوتی ہے برقی روشنی ہر چیز کو نور سے جگمگاتی رہتی ہے۔ دوکان کے اندر شیشوں کے بڑے بڑے طباق اور تختیاں جڑی رہتی ہیں۔ اس آرائش کے بعد یقیناً گذرنے والوں کی نگاہیں دوکان کی طرف اٹھ جائیں گی۔ علاوہ ازیں یورپین تاجر اپنی دوکان کے لئے ایک عام گذرگاہ پسند کرتے ہیں۔ جہاں صبح شام لوگوں کا اجتماع ہوتا رہے ہمارے تاجران تمام باتوں سے غافل شہر کے کسی گوشے میں دوکان لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ چیزوں کو سنوار سجا کر رکھتے ہیں اور نہ اعلان و اشتہار سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر اپنی تجارت میں ناکام ہوتے ہیں۔ دوکانوں کے متعلق ہمارے تاجروں کی مثال ہمارے گھروں کی سی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنی قابلیت اور قدرت سے اپنے گھروں کو جنت کی طرح بارونق بنا رکھیں۔ لیکن غفلت اور بے توجہی نے سارا انتظام درہم برہم کر رکھا ہے۔

عمل اور مشغلہ گھر کے خانگی کام ہوں یا بیرونی اعمال و اشغال دونوں میں یورپین خواتین ہم سے آگے ہیں۔ اگرچہ ہماری دولتمند خواتین اور یورپ کی صاحب ثروت لیڈیاں ایک ہی درجے میں کھیل تماشوں اور فیشن ایبل لباسوں کی دلدادہ ہیں۔ اور ان کا سارا وقت انھیں باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن یورپ کی متوسط طبقہ کی عورتوں کو کھانے پکانے، کپڑوں پر استری کرنے اور تمام دوسرے خانگی کاموں کے کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں کی متوسط طبقہ کی خواتین کو ان کاموں سے بڑا عار ہے یورپ کی مفلس خواتین بھی محنت مزدوری کرتی ہیں اور اس طرح کرتی ہیں کہ اپنا اپنے متعلقین کی شکم پروری کریں۔ لیکن ہماری غریب عورتیں یا تو بھیک مانگنا شر

کردیں گی۔ اور یا پھر اس قدر کم محنت کریں گی کہ اپنا پیٹ پالنا بھی ان کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں ضرورت عمل کی ماں ہے، پھر کیوں ہم شدید ضرورتمند ہونے کے باوجود اپنے دن سستی اور بیکاری میں گذار رہی ہیں۔ ہماری سستی اور ناقابلیت اب اس درجے پر پہونچ چکی ہے کہ کسی عورت کا مصری ہونا ہی یورپین لوگوں کی نظروں میں ایک ناکارہ سست اور نااہل خاتون ہونا ہے۔ غیر ملکیوں کا یہ تخیل کیوں ہم میں چستی اور عمل کے جذبات پیدا نہیں کرتا۔ علم و عمل کی دنیا میں یورپ کی خواتین کو ہم پر جو فوقیت حاصل ہے اس میں ہم کیوں ان کی برابری کے لئے ان کی تقلید نہیں کرتیں۔ کیا ہمارے لئے صرف اسی قدر کافی ہے کہ ہم ظاہری تکلفات اور پوشاک کی خراش و تراش میں اُن کے جیسی بن جانے کی کوشش کرتی رہیں۔ مغربی خواتین نے مجالس اور انجمنیں بنائیں، شفا خانے اور خیراتی ادارے قائم کئے۔ اور اب تو وہ ترقی کر کے ملک کی حکومت میں بھی حصّہ لینا چاہتی ہیں۔ اور اپنے لئے مردوں کی طرح حق انتخاب کا مطالبہ کر رہی ہیں یہ تمام باتیں حقیقت میں نتیجہ ہیں اس علم اور تربیت کا جس کی بنیاد جوش عمل پیدا کرنے پر ہے۔

اس کے بعد موصوفہ نے اپنی تقریر میں رنج و راحت کے مواقع پر اگھر کے نوکروں پر، حاضرات ارواح اور اسی قسم کے ذہنی خرافات پر سرسری تنقید کی ہے۔ اور خاتمے پر اپنے بیان کا نتیجہ نکالتی ہوئی فرماتی ہیں:۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مغربی خواتین علم و عمل کے میدان میں ہم سے کئی منزل آگے ہیں۔ ہم ان سے ذہانت اور ذکاوت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جو کچھ دشواریاں پیش ہیں اپنی کاوش اور محنت سے ہم ان کو دور کر سکتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ارادوں میں قوت اور ہمتوں میں استقلال پیدا کر لیں تو یقیناً بہت جلد ہم بھی علم و عمل کی

اسی منزل پر پہونچ سکیں گی۔ ہمکو یہ نظریہ ماننے میں ہرگز روک نہیں سکتا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" تاریخ سب سے زیادہ منصف قاضی ہے۔ اس کے اوراق مشرقی خواتین کے کمالات و محاسن سے بھرے پڑے ہیں۔ اور یہ اس عہد میں جبکہ یورپ کی عورتوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا مشرق و مغرب کی عرب خواتین کی تاریخوں کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گی کہ کیسی کیسی نادر ذہن و ذکاوت کی عالمہ اور فاضلہ عورتیں گذری ہیں۔ اُن کی علمی مہارت ان کا ادبی ذوق ان کی پر مغز شاعری تمکو اس اعتراف پر مجبور کرے گی کہ حقیقت میں وہ اپنے عہد میں علم و عمل کی سب سے پہلی منزل پر تھیں۔

کمزوریں جب تمیز کی قوت ہی باقی نہیں رہتی تو وہ سمجھنے لگتا ہے۔ کہ قوی جو کچھ کرتا ہے بالکل درست اور عین حکمت ہے۔ یورپ کی لیڈیوں کے سامنے ہماری یہی مثال ہے، تو کیا میری بہنو تم چاہتی ہو کہ ہم قوم کے سامنے اعلان کردیں۔ کہ ہم میں اب تمیز کی قوت نہیں رہی؟ یا تم چاہتی ہو کہ ہم سراپا عمل بن کر اپنی قومیت کی حفاظت کریں، اپنے اندر اور اپنی آنے والی نسل کے اندر استقلال کی روح قوی کرنے کا سامان کریں؟ اگر صحیح معنوں میں ہم کو اپنی قومیت برقرار رکھنی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ یورپ کے تمدن سے ہم وہی خوشے چنیں جو نفع بخش اور ضروری ہیں تاکہ ہم ان کو ملکی بناکر اپنے عادات و اطوار کے موافق بنالیں۔ ہمکو یورپ سے اس کا علم، اس کی چستی، اس کا استقلال و استقامت اور اس کا جوش عمل حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم کو اس سے تعلیم و تربیت کے طریقے اور وہ تمام اسباق سیکھنے چاہئیں جو ہماری کمزوریوں کو قوت سے بدل دیں ہماری خودداری اور استقلال کا ہرگز ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہم یورپ کی اس طرح خوشہ چینی کریں کہ اسی میں ہضم ہوجائیں۔ اور مغرب کی ہولناک طاقت کے سامنے جو کچھ رہی سہی قوت باقی ہے اس کا بھی ہمیشہ کیلئے خاتمہ کردیں۔